ملک کا اقتدار متقی افراد کو دینا ہوگا

﴿مذہب اللہ کے نام پر ایک جعلی کاروبار ہے﴾

جاگیردار، سرمایہ دار اور فوجی ڈکٹیٹر تینوں کی نفسیات ایک ہے اور تینوں کی نفسیات میں جمہوریت کی نفی ہے۔ تینوں کی نفسیات جمہوریت کی نفی پر قائم ہیں۔ جاگیردار اس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے، اس کی نفسیات نے نشونما ایسے ماحول میں پائی ہے کہ اس نے جس بیٹی کو پسند کیا اس کو اُٹھا کر لے گیا۔ اسے قوم کی بیٹی کی عزت اپنی بیٹی کی عزت محسوس ہوتی ہی نہیں ہے۔ جس نے سر اُٹھایا اسی کے گھر میں چوری کروادی، اسی کو اغوا کروادیا، قتل کروادیا۔ وہ جاگیردار جس کی نفسیات اس ماحول میں بنی ہے جب وہ پورے ملک کا اقتدار لیتا ہے تو وہ پورے ملک کو اپنی جاگیر کے طور پر چلانا چاہتا ہے۔

سرمایہ دار کی نفسیات یہ ہے۔ وہ پورے ملک کو اپنی انڈسٹری کے طور پر اور فاؤنڈری کے طور پر چلانا چاہتا ہے۔ پورے ملک کو انڈسٹری بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ سرمایہ دار نے پوری زندگی ایک ہی سبق سیکھا ہے کہ دنیا کا کوئی کام پیسے کے بغیر نہیں ہوتا اور کوئی کام ایسا نہیں جو پیسہ لگائیں تو ہو نہ سکے۔ ایک ہی اُصول ہے اس کا۔ وہ ہر ایک کو خریدنا جانتا ہے۔ ایک چپراسی سے لے کر بجلی کے لائن مین تک، ایک آئی ٹی او سے لے کر انکم ٹیکس کے کمیشنر تک، اس نے ہر ایک کو پیسے سے خریدنا سیکھا ہے۔ جب وہ ملک کے اقتدار پر آتا ہے تو وہ سارے ادارے پیسے سے خریدنا چاہتا ہے۔ اس سے پورے کے پورے ملک کا سسٹم تباہ و برباد ہے۔ اس کے ذہن میں بھی جمہوریت کی نفی ہے۔

اور فوجی ڈکٹیٹر اس نے بھی زندگی بھر ایک ہی بات سیکھی ہے۔ کہ جو حکم دوں آگے نہیں [No] کی کسی کو جرأت نہ ہو۔ جب وہ اقتدار پر آتا ہے تو وہ پورے ملک کو بٹالین کی طرح چلانا چاہتا ہے۔ 76 سال میں ملک کی زمان اقتدار بدل بدل کے ان تین ابلیسی کا طبقات میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے سیاسی اور معاشی میں چہرے ہی بدلتے رہے ہیں۔ نظام نہ بدلنا تھا نہ بدل سکا۔ اور نہ بدلے گا جب تک اقتدار کی کرسیوں پر جاگیردار، سرمایہ دار، بڑے رہے قابض ہیں۔ یہ تینوں کردار ابلیسی

نفسیات کے مالک ہیں، ابلیس کا مادہ [ب ل س] ہے اسی مادہ سے لفظ لباس بنا ہے،، ابلیس بے لباس کرنے والے کہتے ہیں، مذہبی کردار بھی ابلیسی نفسیات کا مالک ہوتا ہے۔

1947ء سے آج تک اس مملکت پاکستان کی تقدیر، اس ملک کا نظام، اس ملک کے غریب کا مقدر کبھی بدل نہیں سکا۔ اگر غریب کو اپنا مقدر بدلنا ہے تو ملک کا اقتدار متقی افراد کو دینا ہوگا۔ حکومتی ایوانوں سے ابلیسی نفسیات کے لوگوں کو نکالنا ہوگا۔ قارئین کرام، انقلاب محض نعروں سے نہیں آتے، انقلاب قربانیاں مانگتا ہے۔

اب ہم مذہب کی نفسیات کو لیتے ہیں مذاہب پرستوں پر اللہ کی طرف سے لعنت ہے۔ کسی قوم پر مسلط مذہب اور ترقی دو متضاد باتیں ہیں۔ لیکن جعلی دوا کو اصلی سمجھ کے کھانے والے زندہ نہیں بچا کرتے اگر بچ جائیں تو صحت کے حوالے سے بہت بڑے نقصان اُٹھاتے ہیں۔ مذہب اللہ کے نام پر ایک جعلی کاروبار ہے۔ اور جعلی چیزیں کبھی بھی خوشحالی نہیں لایا کرتی اور نہ ہی مقصد پورا کرتی ہیں۔۔۔ بظاہر جن مذہبی ملکوں میں آج پیسے کی ریل پیل نظر آتی ہے سو سال پہلے ذرا ان کی حالت تو دیکھیں۔۔۔ اب کسی کے پاس قدرتی طور پر تیل نکل آیا ہے یا کوئی اور خزانے نکل آئے ہیں تو اس وجہ سے وہاں پر عیاشیاں شروع ہوگئی ہیں لیکن یہ عیاشیاں کب تک رہیں گی؟ آخر کار انہوں نے فنا ہونا ہی ہونا ہے۔ مذاہب کو ختم کرنے کے لئے ہی تو اللہ نبیوں کو بھیجتا ہے تا کہ انسان ترقی کر سکے لیکن چند سال بھی نبی نظام نہیں قائم کر پاتے تو یہ مذہبی ظالم پھر سے لوگوں کے جسم اور ذہنوں پر نشے کی طرح قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور دوبارہ وہی غلاظت اور گندگی میں اُتر جاتے ہیں جس میں سے نکالنے کے لئے انبیاء معبوث ہوتے تھے۔

کامیابی۔۔۔ یقین مانیں قدرت ہمیں ہر صورت کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ کامیابی اور ناکامی ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم [قرآن] پر عمل کرنے والا انسان کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ ہم ناکام کیوں ہوتے ہیں؟ ہماری ناکامی کے پیچھے ہماری سوچ کا عمل دخل ہے۔ ہماری سوچ پر منحصر ہے ہمارے حالات کیسے ہوں۔

قدرت نے ہر انسان کو شعور دے کر طاقتور بنایا ہے تمام مخلوقات میں سے انسان سب سے طاقتور مخلوق ہے۔ ہمیں اپنی پہچان نہیں ہے۔ ہر انسان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے وہ جس بھی کام کی صلاحیت رکھتا ہے وہ کوئی نہ کوئی چیز بناتا ہے۔ جھاڑو لگانے والا صرف جھاڑو نہیں لگاتا بلکہ وہ صفائی کرتا

ہے۔اسی طرح ہر بندہ اپنے اپنے پیشے کے مطابق اپنی صلاحیت کو بروئے کار لا کر کوئی چیز بنائے یا بنانے میں اپنی خدمت مہیا کرے دونوں صورتوں میں اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔مار اُس وقت کھاتا ہے جب اپنی صلاحیت کو چھوڑ کر دوسرے انسان کی غلامی قبول کر کے اس پر انحصار کرتا ہے تو یہ طاقتور ہوتے ہوئے بھی کمزور انسان بنتا ہے۔کیونکہ یہ الرحمٰن الرحیم کی پیروی چھوڑ کر اپنے مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔

اپنی خدمات دینے والا بھی اتنا ہی حقدار ہے جتنا خدمت لینے والا۔اصل مسئلہ ہے ہی یہی کہ خدمات دینے والے کی قدر نہیں ہے کیونکہ خدمت دینے والا خدمت لینے والے کو اپنا مالک سمجھتے ہوئے اس کی غلامی کرتا ہے یوں معاشرے میں مالک اور نوکر کی تفریق پیدا ہوتی ہے۔اور وسائل پر قابض ہونے کی روش جنم لیتی ہے جتنا بڑا قابض اتنا بڑا طاقتور بنتا ہے۔سب سے کمزور انسان وہ ہے جو وسائل پر قابض ہوتا ہے وسائل پر قابض رہنے کے لئے ظلم و زیادتی کا سہارہ لیتا ہے اور اپنے ہم خیال لوگوں کو ساتھ ملاتا ہے جہاں طاقت رکھتا ہے زیادتی کرتا ہے اور جہاں دوسرا طاقتور ہو وہاں یہ اس کی غلامی کرتا ہے۔دنیا میں انسانوں کی اکثریت یہی کر رہی ہے اور یہ دونوں صورتوں میں قرآن کی خلاف ورزی ہے۔اسی لئے تو وحی کے ذریعے اسے راہنمائی دی گئی ہے لیکن افسوس مفاد پرست چال چلتا ہے خود بھی ڈوبتا ہے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ڈبوتا ہے۔

معاشرہ مفاد پرستوں پر مبنی ہو جاتا ہے ہر ایک کو اپنی اپنی جیب کی فکر لاحق رہتی ہے ایک دوسرے پر مہربان ہونے کی بجائے ایک دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ اپنی اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے دوسروں کا محتاج بنتا ہے، نادان بھول چکا ہے اللہ اسے اپنے سوا کسی کا محتاج دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔لا الہ الا اللہ پر کھڑا انسان اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔یہاں اپنی حکومت بنانے اور قائم رکھنے کے لئے کتنوں کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے نیچے سے لے کر اوپر تک ہر انسان پر کوئی نہ کوئی حاکم ہے یہ دوسروں پر حاکم ہے۔

مانو یا نہ مانو ہم مسلمان اپنے رَبّ کی نظر میں کامیاب نہیں بلکہ ناکام و نامراد ہیں۔کامیابی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم [قرآن کی پیروی] سے ممکن ہے۔جب انسان اپنی ذمہ داریوں کو عدل و احسان کرتے ہوئے پورا کرتے ہوئے لا الہ الا اللہ کا ثبوت پیش کرتا ہے۔پھر سب کا مالک اللہ ہوتا ہے۔انسان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی بنتے ہیں معاشرے میں اونچ نیچ نہیں رہتی اور نہ ہی کوئی احساس محرومی کا شکار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر راشد شاز

شامِ غریباں

نئے تعلیمی سال کی ابتداء ہو چکی تھی۔یہ جان کر افسوس ہوا کہ بہت سے پرانے احباب جواب تک رسالہ تجدید کی ادارت اور رائٹرز فورم کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں میرے شریک و سہیم رہے تھے، اب نئے تعلیمی کارواں کا حصہ نہ تھے۔شاہد پرویز اور عادل محمود تو پہلے سے ہی تجارت کا ارادہ رکھتے تھے، قمر عباس اور آلِ علی انگریزی ادب کے طالب علم نہ تھے اور حلیم بھائی چونکہ ایک عالمِ جذب میں رہتے تھے اس لئے ان کے بارے میں کچھ اندازہ نہ تھا۔ایک دن ہاسٹل کے بئیرر نے ایک بڑے سائز کا گندمی لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ چھٹیوں میں آپ کے کوئی دوست دے کر گئے تھے میں نے احتیاط سے الماری میں رکھ دیا تھا پھر یاد نہ رہا۔کھول کر دیکھا تو لفافے میں پیتل کا ایک انتہائی نفیس پیپر کٹر (paper cutter) ایک چھوٹی سی تلوار کی شکل میں موجود تھا جس پر علم الانسان مالم یعلم کی آیتِ قرآنی کندہ تھی۔ساتھ میں ایک پتلی سی کاپی تھی جس کے سرورق سے ایک مختصر سا رقعہ ملحق تھا۔لکھا تھا:

’عزیز دوست! سلام و رحمت۔پتہ نہیں اب کب ملاقات ہو، حالات کدھر لے جائیں۔سرِ دست مجھے اپنی والدہ کی خبر گیری کرنی ہے۔بھائی کی موت کے بعد وہ اپنے قابو میں نہیں ہیں۔نقرس کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کو وہ ابھی تک ۱۳ اگست کے سانحے کو بھلا نہیں پائی ہیں۔وہ دن رات روتی رہتی ہیں۔کاش کہ ہمیں بھول جانے پر قدرت ہوتی۔

مگر ہمارا کام تو بھولنا نہیں یاد دلانا ہے تا کہ اگلی نسلیں اس بربریت کو روک سکیں۔تم لوگوں کے اصرار پر کئی بار کچھ لکھنے کی کوشش کی مگر ذہن ساتھ نہیں دیتا۔موقع ملے تو اس تحریر کی نوک پلک درست کر دینا۔ارادہ اس کی باقاعدہ اشاعت کا ہے۔شاید کسی موقع پر علی گڑھ کا ایک چکر لگاؤں۔تب تک کے لئے خدا حافظ۔

عبدالحلیم صدیقی‘

خط پڑھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ خیال آیا، بے چارے حلیم بھائی پتہ نہیں کس حال میں ہوں۔ ان کا تعلیمی سلسلہ ایک بار پھر بحران کی زد میں تھا۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلّی دی کہ شاید وہ جلد ہی لوٹ کر آئیں، ملاقات کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ کاپی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جلی قلم سے لکھا تھا: شامِ غریباں ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء۔ اندازہ ہوا کہ کوئی روزنامچہ قسم کی چیز ہے۔ حاشئے پر لال روشنائی سے طرح طرح کی علامتیں بنائی گئی تھیں۔ کہیں خالی مثلث پر اوپر کی جانب تیر کا نشان بنا تھا تو کہیں بیضوی دائرے کے بیچ میں لکھا تھا: 'وثائق موجود'۔ کہیں لکھا تھا: 'غور طلب' تو کہیں عین تاریخوں کے اندراج سے اوپر ذوالفقار کی چھوٹی سی تصویر بنی تھی۔ تحریر کے خاتمے پر ایک مبہم سا زائچہ وضع کیا گیا تھا جس میں مختلف اعداد و شمار کے بیچ 'سینجلی، سینجلی' کے الفاظ لکھے تھے۔ اب تک حلیم بھائی کی تحریروں کی درستگی کا طریقہ یہ رہا تھا کہ وہ پڑھتے جاتے اور میں سنتا جاتا، درمیان میں انھیں روک کر کوئی مشورہ دے دیتا یا کبھی جملوں کی ساخت میں معمولی تبدیلی کر دیتا۔ اب جو ان کی کاپی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس پر یہ پیچیدہ نقوش و علامتیں نظر آئیں تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دلِ مضطر کو سہارا دینے کے لئے مختلف وادیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ روزنامچے کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی:

علی گڑھ ۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج بخار کا ساتواں دن ہے۔ ڈاکٹر جگر کی لال پیلی گولیوں سے طبیعت اوب گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندرون میں زندگی کی عمارت زمیں بوس ہو گئی ہو۔ کاش کہ خودکشی آسان ہوتی۔ والدہ کا خیال آتے ہی دل کانپ جاتا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ مجھے زندہ رہنا چاہئے تاکہ میں اپنی اس دکھ بھری داستان کو قلم بند کر سکوں۔ لوگوں کو پتہ تو چلے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہی سوچ کر ڈائری لکھنے کی ابتداء کی ہے۔ درد کی امانت سنبھال کر رکھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ خدا مجھے ہمت دے۔

دہلی ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج بچوں کے گھر میں مسلم مجلسِ مشاورت کے اجلاس میں شرکت ہوئی۔

اجلاس تو مجلسِ عاملہ کا تھا مگر علی گڑھ سے کچھ طلباء بھی آ گئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ عیدگاہ میں قتلِ عام کے ایک عینی شاہد کے طور پر شاید مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع ملے گا مگر وہاں تو ہلّڑ کی کیفیت تھی۔ کون کس کی سنتا۔ پہلی بار امت کے بڑے بڑے قائدین کو مشاورت کرتے دیکھا۔ مفتی عتیق الرحمان صدر مجلسِ مشاورت کے علاوہ مولانا علی میاں ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، جماعت اسلامی کے مولانا محمد یوسف، ابراہیم سلیمان سیٹھ، سید شہاب الدین، مسلم مجلس کے ذوالفقار اللہ اور بھی بہت سے لوگ۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جہاں دو مولوی ہوں وہاں ہر مسئلے پر کم از کم تین رائے ضرور ہوگی۔ بس وہی صورت حال تھی۔ بات اس وقت بگڑ گئی جب حاضرین کو یہ لگا کہ ہمارے قائدین سخت موقف اپنانے سے کترا رہے ہیں۔ بالآخر اس بات پر اتفاق ہوا کہ ایک وفد مراد آباد جائے مگر کب جائے یہ کوئی بتانے کو تیار نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے قائدین کو اس سلسلہ میں کوئی جلدی نہ تھی۔ ایک تو قتلِ عام کے ایک مہینے بعد میٹنگ بلائی اس پر بھی یہ نہ لگتا تھا کہ کوئی ٹھوس منصوبہ ان حضرات کے پاس ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مراد آباد کے شہداء پر فاتحہ خوانی کے لئے جمع ہوئے ہوں کاش میں اس جلسہ میں شریک نہ ہوتا تو کم از کم اپنے ملی قائدین کے بارے میں رومانی رائے رکھتا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔

مجلسِ مشاورت کی کارروائی کو قریب سے دیکھ کر اس لطیفے پر یقین پختہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ابلیس کی مجلس میں بہت سے شیاطین اپنی اپنی کارروائیوں کی رپورٹ دے رہے تھے۔ ابلیس نے جاننا چاہا کہ اللہ کے ان نام لیواؤں کو جو خود کو آخری پیغام کا حامل سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہیں ان کی ہمتیں توڑنے کے لئے تم لوگوں نے کیا کیا؟ یہ سن کر ایک شیطان بڑے فخر سے اٹھا، کہنے لگا مراد آباد میں نمازیوں پر گولیاں چلوائیں، مسلمانوں کے کاروبار تباہ ہو گئے، ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے، اس سے ابھرنے میں انہیں برسوں لگ جائیں گے۔ مگر اس رپورٹ کو ابلیس نے ہلکے میں لیا۔ ایک دوسرے شیطان نے کہا:

حضور ہم نے مسلم تعلیمی اداروں میں پھوٹ ڈال دی۔ مگر ابلیس پر اس بات کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں نے مدرسوں میں غور وفکر اور نئے علوم کے راستوں پر روک لگا دی، اسلاف پرستی کو رواج دیا، ایک دوسرے شیطان نے بازی مارنے کی کوشش کی۔ مگر ابلیس پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا اور بھی کسی کے پاس کچھ کہنے کو ہو تو بتائے۔ تب ہی ایک منحنی سا شیطان کھڑا ہوا، بولا: حضور میں نے مسلم مجلسِ مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنیاد رکھوا دی ہے جس کی بنا میں اقدامی عمل سے پہلوتہی کا وہی پرانا فارمولہ ہے یعنی دوارا کین اور تین رائے۔
یہ سن کر ابلیس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس منحنی سے شیطان کو گلے لگا لیا۔ بولا تم نے صحیح ہدف پر نشانہ لگایا اب یہ لوگ ان تنظیموں میں بیٹھ کر اپنے دشمنوں سے ہی دستِ سوال دراز کریں گے، ہر ظلم کے بعد انکوائری کا مطالبہ کریں گے کسی اقدامی عمل پر ان کے اندر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکے گا۔

علی گڑھ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج دہلی سے واپسی ہوئی۔ مراد آباد اب بھی جل رہا ہے۔ ماموں سے فون پر بات ہوئی بہت مایوس تھے۔ مسلمانوں کی فیکٹریوں کے لائسنس منسوخ کئے جا رہے ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں غیر قانونی اسلحے بناتے ہیں۔ پولس نے بعض غریب مسلم گھروں سے 0.32 بور کی پستول ضبط کی ہے۔ گویا اب مسلمانوں کو غیر قانونی اسلحہ کے جرم میں پھنسانے کی تیاری ہے۔ مسلمان اور فیکٹری؟ کیسا مذاق ہے۔ ہاں کبھی ایسا تھا پر اب تو ان کی اکثریت مزدوروں پر مشتمل ہے۔ اور مسلمانوں کی یہ فیکٹریاں جن پر اسلحہ سازی کا الزام ہے انہیں تو فیکٹری کہنا بھی تکلف ہے۔ کیا ہوتا ہے ان فیکٹریوں میں؟ ایک چھوٹی سی دھونکنی والی بھٹی، ایک سائکل کا پرانا ریم، لوہے کے کسنے اور کھولنے والے کچھ فرمے، چند پلاس اور پیچکس اور ایک ڈریلنگ مشین۔ یہ ہے مسلم فیکٹری کا کل ساز وسامان جہاں کٹے، طمنچے اور پستول تیار ہو سکتے ہیں۔ بعض ماہر فن اصلی پستول کی ایسی نقل تیار کر لیتے ہیں جس پر اصل کا گمان ہوتا

ہے۔ اور اس کی قیمت اصل کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوتی۔ حکومت کے لئے یہ معلومات نئی نہیں ہیں۔ ماضی میں عدالتوں نے یہ مشورے بھی دئے ہیں کہ ان فنکار ہاتھوں کو ڈھنگ کا کام دیا جائے تا کہ ان کا ٹیلنٹ صحیح کاموں میں صرف ہو۔ مگر حکومت تو مسلمانوں کو بدنام کرنے پر تلی ہے۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی۔ وہ مسلمانوں کے قتل عام کا الزام بھی مسلمانوں پر ہی ڈال دیتی ہے۔

علی گڑھ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء

روزنامہ قومی آواز میں آج یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے کہ مسلم مجلسِ مشاورت کے قائدین کا ایک وفد وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملا ہے۔ خبر جس انداز سے لکھی گئی ہے اس سے یہ تاثر قائم ہوتا جیسے یہ ملاقات ہمارے قائدین کی ایک بڑی حصولیابی ہو۔ پیارے قائدین! حوصلہ رکھیں، ابھی آگے اور بھی بہت سے مراد آباد آئیں گے، وزیر اعظم کے درشن کا آپ حضرات کو موقع ملتا رہے گا۔
مگر یہ ملاقات تو بہت مہنگی ہے۔ ڈھائی ہزار مسلمانوں کے خونِ ناحق اور پورا ایک شہر ویران ہونے کے بدلے آپ کے حصے میں صرف یہ منحوس درشن آتا ہے۔ ہے نا عجیب بات؟

علی گڑھ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خبروں سے واضح ہے کہ مشاورت کا یہ وفد مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کے بجائے دراصل وزیر اعظم کی ایماء پر بلکہ ان کی اجازت لے کر مراد آباد کے لئے روانہ ہوا۔ مراد آباد کی ضلعی انتظامیہ نے قائدین کے اس وفد کا استقبال کیا اور انہیں سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ کمشنر اور ڈی آئی جی نے ۱۹ لوگوں پر مشتمل اس وفد کو شہر کے مسلم اور غیر مسلم عمائدین سے ملوایا۔ یہ وفد صبح گیارہ بجے پہنچا تھا اور اسے شام ڈھلنے سے پہلے شہر سے نکلنے کی جلدی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ ان کا رات میں یہاں قیام خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیڈری میں خطرہ مول لینے کا اب رواج

نہیں۔ چلئے رسم ادا ہوگئی۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑیئے۔ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔

علی گڑھ، ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

ماموں سے آج پھر گفتگو ہوئی۔ مسلمانوں کو ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔ حکومت مسلمانوں کے کوائف جمع کر رہی ہے: کن لوگوں کا کتنا نقصان ہوا، چھوٹی گھریلو فیکٹریاں کہاں کہاں ہیں، ان میں کس کس عمر کے کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟ ان میں ۱۶ سے ۳۰ سالوں کے نوجوان کتنے ہیں؟ اور اسی قسم کے دیگر سوالات۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت شاید کوئی امدادی پیکج دینا چاہتی ہے، بعض اس بات سے خائف ہیں کہ اگر ان کا مقصد ہماری مدد کرنا ہوتا تو ہمارے نوجوانوں کی فہرست کیوں بنائی جارہی ہے۔ ابھی ان ہی نوجوانوں کی رہائی نہیں ہوسکی ہے جو قتل عام کے بعد گھروں سے اٹھائے گئے۔ پتہ نہیں یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ پولس اب بھی گھر گھر تلاشی لیتی پھرتی ہے اور جسے جی چاہتا ہے اٹھالے جاتی ہے۔ کسے مجال کہ مزاحمت کرے۔ مزاحمت کرنے والے یا تو مارے گئے یا جیلوں میں بند ہیں۔ اب تو دب دب کر اور گھٹ گھٹ کر جینے کا رواج ہے۔ ایک عورت نے جس کے شوہر کو پولیس لئے جارہی تھی آواز بلند کی تو پولیس والے نے اس کی گود سے دوسالہ بچے کو لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ سنا ہے تب سے بچہ سکتے میں۔ بے چاری عورت کیا کرے بچے کو دیکھے یا شوہر کو۔ کتنی بے بسی ہے۔ کاش کہ ہمارے قائدین اس صورتِ حال کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے۔ پتہ نہیں خدا نے ہمیں کس کے بھروسے چھوڑ دیا ہے؟ ہماری یہ درگت اسی لئے تو ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ مگر اسلام تو ہماری زندگیوں سے غائب ہے پھر خدا کی نصرت کیسے آئے۔ یہ عجیب مخمصہ ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سرِ عرش تماشا کیا ہے؟

پوری کاپی اسی طرح کے دردناک اندراجات سے پر تھی۔ کہیں غیروں کی ستم ظریفی کا شکوہ تھا تو کہیں اپنوں کی کم نگاہی کا ماتم۔ اوراق الٹتے ہوئے میری نگاہ ۱۳۰ اکتوبر کے ایک اندراج پر اٹک کر رہ گئی۔ لکھا تھا: 'سنا ہے تلافیٔ مافات کے طور پر لکھنؤ میں پیامِ انسانیت کا ایک بڑا جلسہ ہوا

ہے۔ قیصر باغ میں بھلے ہندو اور ڈرے سہمے مسلمان ایک ساتھ اسٹیج پر بیٹھے۔ ملک کے ضمیر کو جگانے کی بات کی گئی۔ بتایا گیا کہ یہ فسادات دراصل حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی، حسد اور تنگ نظری کے سبب برپا ہوتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے اس لطیفے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یا تو ہمارے قائدین واقعی عقل سے پیدل ہیں یا وہ اصل صورتِ حال پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ تو narrative بدلنے کی کوشش ہے۔ اول تو مرادآباد میں کوئی ہندو مسلم فساد نہ ہوا یہاں تو پولس نے منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ دوم اس کا اصل مقصد مسلمانوں کا حوصلہ توڑنا ہے تاکہ وہ اپنی تنظیم نو کا خیال دل سے نکال دیں اور کانگریس کا ووٹ بینک بن کر رہیں۔ پھر اس بات کو ہم کیوں نہیں کہتے؟ لگتا ہے مرادآباد کے مظلوموں کی آہ و بکا ان پرشور تقریروں میں گم ہو جائے گی۔ یا للعجب!'

میں نے کاپی بند کی۔ ایک نظر پیپر کٹر پر ڈالی۔ اس کی تراش خراش میں نفاست نمایاں تھی۔ میں نے سوچا ایک زمانہ تھا جب اصحابِ علم اور اصحابِ سیف کے حلقے باہم ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ امت کا دانشور اور خطیب، فنِ سپہ گری اور شہہ سواری کا بھی ماہر ہوا کرتا تھا۔ مگر جب سے سیف و قلم کا تعلق ایک دوسرے سے ٹوٹ گیا امت میں قیادت کا 'گفتار ماڈل' عام ہوگیا۔ بڑے بڑے حوادث کے جواب میں ایک جلسہ کرنا مسئلہ کا حل سمجھ لیا گیا۔

حلیم بھائی کی ڈائری خاصی طویل تھی۔ اس میں تاریخی اعتبار سے بہت سی کام کی باتیں تھی ہر صفحہ درد و کرب سے لبریز تھا مگر اس کے باوجود اس میں وہ کیفیت نہ تھی جو حلیم بھائی کے زبانی بیان کو سن کر پیدا ہوا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں ۱۳ راگست کی شامِ غریباں کا بیان کرتے اور ان ماؤں کی گریہ زاری کی مقامی لب و لہجے میں تصویر کشی کرتے جن کے معصوم بچّے عیدگاہ میں پولس کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے تو کلیجہ منھ کو آجاتا۔ ایسا لگتا ان کے منھ سے الفاظ نہیں غم واندوہ کے دلخراش پیکر نکل رہے ہوں۔ خیال آیا کاش حلیم بھائی صرف ۱۳ راگست کی شام غریبا ں پر پوری کتاب لکھ ڈالتے۔ یہ سوچ کر میں نے مسودہ کو احتیاط سے الماری میں رکھا اور کھڑکی سے باہر حبیب ہال کے اندرونی لان میں دیکھنے لگا جہاں گلابی جاڑے کی دھوپ میں کچھ طلباء اخبار بینی کا لطف لے رہے تھے اور کچھ ان خبروں پر تبصرے میں مصروف تھے۔ یہاں بھی قیادت کا گفتار ماڈل سکہ رائج الوقت تھا۔

تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابوحیان سعید

ڈاکٹر کاشف خان کے عقائد

ڈاکٹر کاشف ایک وڈیو میں فرمارہے ہیں کہ قرآن کریم میں جن انبیاء کا ذکر ہے وہ اللہ کے صحیفوں کے نام ہیں۔یعنی قران کریم میں جن سولہ سترہ انبیاء کا ذکر ہے وہ انسان نہی تھے بلکہ صحیفے تھے۔۔

اس بات کو تو تمام قرانسٹ مانتے ہیں کہ وحی کے نزول وابلاغ کے لئے میڈیم یعنی واسطے کی ضرورت ہوتی ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ اگر انبیاء صحیفے تھے تو نازل کس پر ہورہے تھے؟ میڈیم کیا تھا؟ انبیاء علیہ الصلواۃ السلام کو انسان ماننے سے انکار کی کیا وجہ ہے؟ اور قران کریم میں سورۃ الاعلی آیۃ 18-19 میں صحف الاولی اور صحف ابراہیم وموسی کا ذکر ہے تو ان سے کیا مراد ہے؟ رنگ برنگے قرانسٹوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ صحف سے مراد کبوتر ہے لے لیا جائے!

علامہ پرویزؒ نے جہاں صدیوں کی جہالت کے بت پاش پاش کی وہاں ایک ظلم یہ بھی کیا کہ سینکڑوں ان پڑھ، فارغ العقل مترجم اور مفسرین قرآن کی ایک ایسی کھیپ پیچھے چھوڑ گئے کہ جس نے پرویزؒ کی چند کتابیں پڑھ کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ جی پرویز تو کچھ بھی نہیں تھا اصل تو ہم ہیں اور پھر قرآن کریم کے ساتھ ایسا کھلواڑ شروع کیا کہ پرویزؒ اگر زندہ ہوتے تو خودکشی کر لیتے یا ساغر کی طرح داتا دربار آ بیٹھتے!

سورۃ الاعلی آیۃ 18-19 بالکل واضح ہے کہ ابراہیم اور موسی سے پہلے بھی انبیاء پر صحائف (وحی) نازل ہوتے رہے۔

سورۃ البقرہ کی آیۃ 260 ,258 کا مطالعہ کریں اذ قال ابراہیم ربی الذی۔۔اگر ہم ڈاکٹر کاشف خان کی بات مان لیں تو ابراھیم نامی صحیفہ کہہ رہا ہے اے میرے رب۔۔۔تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ صحیفے بولتے بھی تھے۔

سورۃ البقرہ کی آیات 132 سے 134 تک غور سے سمجھ کر مطالعہ کیا جائے تو دنیا سے رخصت ہوتے وقت یعقوب علیہ السلام کا اپنی اولاد کے ساتھ مکالمہ سامنے آتا ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ یعقوبؑ اپنی اولاد سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے بعد کس کی تابعداری کرو

گے؟ تو اولاد نے کہا اس ایک اللہ کی تابعداری کریں گے جس اللہ کو آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق نے الہ مانا ہے اور ہم اسی الہ کے مسلم ہیں۔۔اب کوء ڈاکٹر کاشف خان سے پوچھے کہ یہ مکالمے انسانوں کے درمیان ہو رہے ہیں یا صحیفوں کے درمیان ہو رہے ہیں؟

سورۃ البقرہ آیۃ 285، سورۃ النساء آیۃ 136 میں ملائکہ، کتب، رسول کا بیان ہے جس میں کتب اور رسول کو جدا جدا سمجھایا گیا ہے۔قرآن کریم میں جس امر کی طرف خصوصی توجہ دلاء جاتی ہے وہاں ذلک، تلک، یسئلونک، یستفتونک وغیرہ استعمال ہوئے ہیں، ان میں زبردستی واحد مذکر، واحد مونث، جمع مونث کی تک بندی کر کے صرف عربی دانی کا طومار باندھنا نامناسب اور مضحکہ خیز ہے۔لیکن ڈاکٹر کاشف خان قسم کے افراد نے قرآن کریم کے من مانے مفاہیم بیان کی ہیں۔

اب آئیں ذرا ان کی تحریر کے ایک عجیب وغریب اقتباس کی طرف جو صوت الحق کے جولائی 2025 کے صفحہ نمبر 07 پر ہے۔۔۔جن جلیل القدر لوگوں پر اللہ کا کلام نازل ہوا وہ عظیم المرتبہ انسان عام انسانوں سے بڑھ کر ذہین وفطین اور اپنے وقت کی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے مگر قرآن نے ان کا نام اس لئے زیادہ پرموٹ نہیں کیا کہ کہیں لوگ اللہ کے کلام میں بتائے جانے والی اصل بات کو چھوڑ کر ان شخصیات کی پوجا پاٹ نہ شروع کر دیں۔(کتنی اچھی اور واضح بات کی ہے لیکن اگلے ہی لمحے پٹڑی سے اتر گئے، ملاحظہ فرمائیں)

?۔البتہ کہیں کہیں انسانوں کا ذکر بھی قرآن میں ملتا ہے مگر انسانوں کا ذکر قرآن میں کثرت سے نہیں دکھائی دیتا بلکہ قران میں آنے والے جن ناموں کو ہم انسانوں یا نبیوں کے نام سمجھتے ہیں ان میں سے زیادہ تر اللہ کے صحیفوں کے نام ہیں جن کو قرآن رسول بھی کہتا ہے۔ ان الفاظ کو پڑھیں اور یہ بتائیں کہ کون کون نبی ہے اور کون صحیفہ؟ ڈاکٹر کاشف خان کی عقل پر حیرت ہے۔

ہم قرآنسٹوں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن قرآنسٹوں کی اکثریت کی طرح ڈاکٹر کاشف خان بھی پٹڑی سے اُترنے میں بہت جلدی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کاشف خان صاحب ذرا یہ فرما دیجیئے کہ وحی الٰہی کے نزول کے کیا مقاصد رہے ہیں؟ کیا وحی اس قسم کی بحث کے لئے نازل کی جاتی ہے کہ انبیاء کا مطلب صحیفے ہوتے ہیں؟ کیا وحی کا نزول اس لئے ہوتا ہے کہ تلک سے مراد مؤنث واحد نہی بلکہ مؤنث جمع ہوتا ہے، بہت خوب! آوا گون

کا اسلامی فلسفہ بھی تفصیل سے بیان فرما دیجیئے تا کہ ہم ایک ہی بار میں مکمل گمراہ ہو سکیں، قسطوں میں کیوں گمراہ کرنا چاہتے ہیں جناب!

سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 52~51 ملاحظہ فرمائیے۔۔۔موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مکالمہ چل رہا تھا جب فرعون لاجواب ہو گیا تو اب لوگوں کو اشتعال دلانے کے لئے ایک جذباتی سوال داغا۔فرعون نے کہا: "اگر تم کہتے ہو کہ تمہارا خدا سچا ہے اور اسی کے دین کی پیروی کرنی چاہیے اور ہم اپنے باپ دادا کے جس دین پر ہیں وہ غلط ہے تو پھر بتاؤ ہمارے باپ دادا کے ساتھ تمہارا خدا کیا معاملہ کرے گا۔" یہ ایسا سوال تھا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام صاف کہہ دیتے کہ تمہارے باپ دادا سارے مشرک تھے اور جہنم میں جائیں گے تو پوری قوم اپنے باپ دادا کے بارے میں یہ بات سن کر غصے میں آ جاتی اور موسیٰ علیہ السلام کی ساری دعوت پر پانی پھر جاتا۔موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بہت حکمت بھرا جواب دیا، انہوں نے خدا کے فیصلے کو خدا پر ہی چھوڑ دیا اور فرمایا:

قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَٰبٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى....(سورۃ 20 طٰہٰ-آیت 52)

"اس کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔"

یہی انبیا کی دعوت کا طریقہ تھا کہ وہ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے۔

اب ڈاکٹر کاشف خان اور ان کے حواری ذرا یہ وضاحت کر دیں کہ یہ گفتگو موسیٰ نام کے صحیفے اور فرعون کے درمیان ہو رہی ہے یا موسیٰ نام کے رسول اور فرعون کے مابین ہے۔

درج بالا مضمون شائع شدہ ماہنامہ صوت الحق شمارہ جولاء 2025 میں تلک تلک کی گردان کر کے تلک کو مؤنث جمع تک محدود کر کے رسول/ نبی کو مؤنث ثابت کرنے کی مضحکہ خیز کوشش بھی کی گئی ہے، ڈاکٹر کاشف خان آپ نے جس سے بھی عربی قواعد سیکھے اس بیچارے کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ **تلک، ذلک، یسئلونک، یستفتونک** خاص اشارے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس کا مذکر یا مؤنث سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اگر یہ قواعد آپ پر نازل ہو رہے ہوں تو پھر آپ کا قصور ہی نہیں ہے۔جناب یہ کوئی اردو قواعد تھوڑی ہیں کہ پیالہ مذکر ہو اور پیالی مونث ہو، ہتھوڑا مذکر ہو اور ہتھوڑی اس کی گھر والی ہو! گاڑی ہونا چاہیئے یا گاڑی ہونی چاہیئے قسم کی منطقی باتیں کھیل تماشوں میں تو چل جاتی ہیں۔

عجمیوں کی عربی گرامر کے گھن چکر میں ہم نے بہت اچھے ذہین لوگوں کو اس قسم کی بحث میں اپنی پوری زندگی لگاتے دیکھا کہ "یاجوج وماجوج کیا ہیں"، "سورۃ الفیل میں فیل کا مطلب ہاتھی نہیں ہے، ابابیل کے معنی یہ نہیں یہ ہیں"، "بنی اسرائیل سے یہ مراد ہے"، "بقرۃ کے معنی گائے نہیں فلاں چیز ہے"، "رسول کا مطلب یہ نہیں وہ ہے"، "قریش کے معنی یہ نہیں ہوتے یہ ہوتے ہیں"، سورۃ النساء میں نساء سے مراد عورت نہیں فلاں مطلب ہے"، "المحیض کا مطلب یہ نہیں وہ ہے" غرض یہ کہ اس قسم کے معنی ومطالب کی خود پرستی کی کھوج میں اچھے خاصے عقل مندوں کو دیوانہ ہوتے دیکھا ہے، کچھ عقل مندوں نے تو حروف مقطعات کے معنی اور مطالب اخذ کرنے میں اپنی پوری زندگی لگا دی اور بالآخر الحاد کی وادیوں میں اتر گئے۔ پرویزؒ کے ربوبیت اور نظام کے گھن چکر میں بہت لوگوں کو فلسفے بگھارتے اور دنیا سے جاتے دیکھا۔

ڈاکٹر کاشف خان قسم کے لوگ بہت جلد ملحدین کے گماشتے بن جاتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات کی ترتیب ایسی نہیں ویسی ہونی چاہیئے، بنی اسرائیل کے واقعات بہت زیادہ کیوں بیان کئے گئے ہیں، فلاں واقعہ فلاں جگہ بیان نہیں ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ یعنی ڈھکے چھپے الفاظ میں کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ نے وحی کے نزول سے پہلے ڈاکٹر کاشف خان سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟

ہمارا انتہائی ذاتی خیال ہے کہ ڈاکٹر کاشف خان کی مثال اس ٹرین ڈرائیور جیسی ہے جو گائے کو پٹڑی پر دیکھ کر گائے کے پیچھے ٹرین لے دوڑا اور گائے کا پیچھا کرتے کرتے بالآخر ٹرین کو کھیتوں میں لے جا کر الٹا دیا۔۔

ہم تو اللہ سے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ہم کو فرقہ پرستوں اور خاص طور پر اس قسم کے قرآنسٹ لوگوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے جو قرآن کریم کے اصل پیغام کی بجائے عربی قواعد پر بحث ومباحثہ کر کے قرآن کریم کی اصل تعلیمات پر پردہ ڈالنے کی کوششوں میں مصروف عمل ہیں ا۔

عیش دہلوی نے شاید ان جیسے صاحبان کے لی؟ فرمایا ہوگا۔۔۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

سید ناظر علی[لندن]

قرآن کا رازق اللہ ہے

﴿یہی زندگی کا اٹل اُصول ہے کہ کچھ بھی مستقل نہیں ہے﴾

زندگی کا سفر بھی بہت عجیب ہے، ہم دنیا میں خالی ہاتھ آتے ہیں، سب کچھ پانے اور مال بنانے کے لئے پوری طاقت کے ساتھ دوڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، اور پوری زندگی اکھٹا کرنے میں لگے رہتے ہیں، سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں اور پھر سب حاصل شدہ مال چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

بغیر لباس آئے تھے اس جہاں میں
ایک کفن کی خاطر اتنا سفر کرنا پڑا

امیری، غریبی، رزق کی کمی بیشی، حالات کی تنگی اور فراخی جیسے بنیادی مسائل سے شاید ہی کوئی انسان خود کو مبرہ سمجھتا ہو بھلا کون نہیں چاہتا کہ وہ امیر بھی ہو حالات ہمیشہ اس کے حق میں ہوں تو دور تک تنگی کا نام ونشان تک نہ ہو، چار چار بیویاں اور بیٹوں کی فوج ہو، مال و ذر کے انبار لگے ہوں ہمیشہ صحت وتندرستی اور نا ختم ہونے والی زندگی خوشیاں ہی خوشیاں ہوں اور کوئی غم نہ ہو، لیکن اُس کے برعکس حقائق کچھ اور ہی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان غریب ہو یا امیر زندگی کے تمام تر مسائل اور الجھنیں دونوں قسم کے انسانوں کو درپیش رہتے ہیں جبکہ ایک غریب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ امیر اور ثروت مند لوگ شاید اس سے زیادہ بہتر اور پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس چیز کو لے کر معاشرے کا غریب طبقہ احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔

تو آیئے دیکھتے ہیں کہ خالق کائنات کی یہ تقسیم کس مصلحت کی بنیاد پر ہے کیوں لوگوں کو امیر غریب رزق کی کمی بیشی جیسے مسائل جیسی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے قرآن کی سورہ شوریٰ میں اللہ فرما رہے ہیں

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ

خَبِیْرٌ بَصِیْرٌ [شوریٰ -42/27]

اگر اللہ اپنے بندوں کی روزی فراخ کر دیتا تو وہ زمین میں فساد برپا کر دیتے لیکن وہ اندازے کے ساتھ جو کچھ چاہتا ہے نازل فرماتا ہے، وہ اپنے بندوں سے پورا خبردار ہے اور خوب دیکھنے والا ہے O

اس آیت میں واضح طور پر اللہ فرما رہے ہیں، اگر اللہ اپنی بنی آدم مخلوق کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے یقیناً وہ انسانوں کی نفسیات سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے

سورہ الرعد میں اللہ فرما رہے ہیں

اَللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ فَرِحُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ [الرعد-13/26]

اللہ جس کی روزی چاہتا ہے بڑھاتا ہے اور گھٹاتا ہے،، یہ تو دنیا کی زندگی میں مست ہو گئے ہیں ،، حالانکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں نہایت [حقیر] پونجی O

اللہ کی طرف سے رزق،، اللہ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے، مگر یہ تو دنیا کی زندگی میں مست ہو گئے ہیں حالانکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں پونجی ہے۔ اس آیت میں اللہ کا چاہنے سے مراد پس پردہ رزق کے اللہ کے مقرر پیمانے ہیں اس آیت میں واضح کہہ دیا گیا ہے کہ دنیا میں سامان معیشت اللہ کے مقرر کردہ قانون/پیمانوں کے مطابق ملتا ہے ،، یہ جو اللہ نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانیت کے رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں، ان کا انجام خراب ہوتا ہے، تو یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی ہے، اس کے بعد کچھ نہیں، لہٰذا وہ اسی دنیا کے مفاد کو اپنا نصب العین قرار دے لیتے ہیں اور اس میں مگن رہتے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ اگر انسان کا مستقبل [اُخروی زندگی] تاریک رہے تو اس زندگی کی خوش حالی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ لوگ دنیاوی زندگی میں مگن ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

قرآن کی سورہ نحل میں اللہ فرما رہے ہیں۔۔۔ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت آتا کی ہے

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰی مَا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِیۡهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ یَجۡحَدُوۡنَ[16/71]

اللہ ہی نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر روزی میں زیادتی دے رکھی ہے [اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت آتا کیا ہے]، پس جنہیں زیادتی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے ماتحت لوگوں کو نہیں دیتے کہ وہ اور یہ اس میں برابر ہو جائیں، تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہو رہے ہیں O

یعنی جب تم اپنے ماتحتوں، مزدوروں، کسانوں، معاشرے کے کمزور لوگوں کو اتنا "مال اور اسباب دنیا" نہیں دیتے کہ وہ تمہارے برابر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کب یہ پسند کرے گا کہ تم کچھ لوگوں کو، جو اللہ ہی کی مخلوق ہیں، انہیں اللہ کا شریک اور اس کے برابر قرار دے دو، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معاشی لحاظ سے انسانوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے فطری نظام کے مطابق ہے، اسے جبری قوانین کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ اشتراکی نظام میں ہے، یعنی معاشی مساوات کی غیر فطری کوشش کے بجائے ہر کسی کو معاشی میدان میں کسب معاش کے لئے مساوی طور پر دوڑ و دھوپ کے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔

سورہ آل بنی اسرائیل آیت نمبر 30 میں اللہ فرما رہے ہیں

اِنَّ رَبَّكَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا[17/30]

یقیناً تیرا ربّ جس کے لئے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر اور انہیں دیکھ رہا ہے O

اس آیت میں اہل ایمان کے لئے تسلی ہے کہ ان کے پاس وسائل رزق کی فراوانی نہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ہاں ان کا مقام نہیں ہے بلکہ یہ رزق کی وسعت یا کمی، اس کا تعلق اللہ کی حکمت و مصلحت سے ہے جسے صرف وہی جانتا ہے، وہ اپنے دشمنوں کو قارون بنا دے اور اپنوں کو اتنا ہی دے کہ جس سے بہ مشکل وہ اپنا گزرہ کر سکیں، یہ اس کی مشیت ہے، جس کو وہ زیادہ دے، وہ اس کا محبوب نہیں اور قوت لایموت کا مالک اس کا مبغوض نہیں یعنی یہ لوگ اللہ کے غضب میں نہیں ہیں۔

سورہ طہٰ آیت نمبر 81۔ کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا

غضب ٹوٹ پڑے گا اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہے گا

كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَ لَا تَطۡغَوۡا فِیۡهِ فَیَحِلَّ عَلَیۡكُمۡ غَضَبِیۡ ۚ وَ مَنۡ یَّحۡلِلۡ عَلَیۡهِ غَضَبِیۡ فَقَدۡ هَوٰی[طٰہٰ-20/81]

تم ہماری دی ہوئی پاکیزہ روزی کھاؤ اور اس میں حد سے آگے نہ بڑھو، ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا، اور جس پر میرا غضب نازل ہو جائے وہ یقیناً تباہ ہوا O

اس آیت میں وَ لَا تَطۡغَوۡا فِیۡهِ کے الفاظ ہیں۔۔ لفظ طغیان کے معنی ہیں تجاوز کرنا، یعنی حلال اور جائز چیزوں کو چھوڑ کر حرام اور ناجائز چیزوں کی طرف تجاوز مت کرو، یا اللہ کی نعمتوں کا انکار کر کے یا کفران نعمت کا ارتکاب کر کے یا منعم کی نافرمانی کر کے حد سے تجاوز نہ کرو، ان تمام مفہومات پر طغیان کا لفظ صادق آتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طغیان کا مفہوم ہے، ضرورت و حاجت سے زیادہ پرندے پکڑنا یعنی حاجت کے مطابق پرندے پکڑو اور اس سے تجاوز مت کرو۔

سورہ نحل آیت نمبر 112... اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بافراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرۡیَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً یَّاۡتِیۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا مِّنۡ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَ الۡخَوۡفِ بِمَا كَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ[النحل-16/112]

اللہ اس بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو پورے امن و اطمینان سے تھی اس کی روزی اس کے پاس بفراغت ہر جگہ سے چلی آ رہی تھی، پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفر کیا تو اللہ نے اسے بھوک اور ڈر کا مزہ چکھایا جو بدلہ تھا ان کے کرتوتوں کا O

اس آیت میں اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان فرمائی ہے کہ کفران نعمت کرنے والے لوگوں کا یہ حال ہوگا،، وہ جہاں بھی ہوں اور جب بھی ہوں۔

قارئین کرام قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ جب اس کی آیات ہمارے سامنے آ جاتی ہیں تو ہمارے اپنی تمام افکار کل و دانش نظریات و سوچ و بچار سب دفن ہو کر رہ جاتے ہیں، ان آیات کے آ جانے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ مزید وضاحت درکار ہے بھلا ان آیات سے بڑھ کر

اب اللہ کیا کھول کھول کر بیان کرے وہ اپنی آیات کی تفصیل خود ہی بیان فرمادیتا ہے رزق کا مالک صرف اللہ کی ہستی ہے جس کا چاہے کشادہ کردے جس کا چاہے تنگ اور اس کا رزق دینے کا توازن بھی ایک زبردست مصلحت کی بنیاد پر ہے کہ اگر وہ سب کو ایک جیسا برابر رزق دے دیتا یعنی سبی کو امیر کردیتا تو شاید کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کے کام بھی نہ آتا اگر آپ کسی مستری کو کہتے کہ میرا گھر تعمیر کردے تو وہ کہتا کہ جاؤ بھائی میں خود سیٹ آدمی ہوں کیوں کر تمہاری مزدوری کروں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رزق کے معاملے میں ایک دوسرے پر فضیلت دے کر ایک دوسرے کی ضرورت بنادیا مزید اس نے یہ بھی بتادیا کہ سرکشی اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کا کفران یا انکار کرنے سے اللہ انسانوں پر بھوک اور خوف کی مصیبتیں سزا کے طور پر نازل فرماتا ہے۔ قارئین کرام۔۔ کہیں یہ ہمارے ملک پاکستان کی بات تو نہیں ہو رہی ہے

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اللہ انسان کے رزق میں اضافہ کیسے کرتے ہیں سورہ حج آیت نمبر 50 پچاس پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ [الحج-22/50]

پس جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان ہی کے لئے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے O

سورہ الاحزاب آیت نمبر 33 اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور نیک عمل کرے گا اس کو ہم دوہرہ اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لئے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے۔

وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا [الاحزاب-33/31]

اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر دوہرا دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے O

اس آیت میں بتایا گیا ہے جس طرح گناہ کا وبال دگنا ہوگا، نیکیوں کا اجر بھی دوہرا ہوگا۔

سورہ طلاق آیت نمبر 3 میں اللہ فرمارہے ہیں۔۔ اور اسے ایسے راستے سے رزق دے

گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے اللہ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر [پیمانے] مقرر کر رکھے ہیں۔

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا [الطلاق-65/3]

اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہوگا، اللہ اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا، اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے O

سورہ طلاق آیت نمبر 60 ساتھ خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلّف نہیں کرتا بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرمادے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَّاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى [الطلاق-65/6]

کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہئے، اور جس پر اس کے رزق کی تنگی کی گئی ہو، اسے چاہئے کہ جو کچھ اللہ نے اسے دے رکھا ہے اسی میں سے اپنی حسب حیثیت دے، کسی شخص کو اللہ تکلیف نہیں دیتا مگر اتنی ہی جتنی طاقت اسے دے رکھی ہے، اللہ تنگی کے بعد آسانی وفراغت بھی کر دے گا O

سورہ الطلاق میں اللہ یہ فرمارہے ہیں کہ جو اللہ پر اعتماد توکل کرتے ہیں، اللہ ان کو آسانی وکشادگی سے بھی نواز دیتا ہے۔

سورہ فجر آیت نمبر 16 ۔۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کردیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے ذلیل کردیا ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے اور میراس کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو O

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (16) كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ

(17) وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (18) وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (19)
وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا [فجر-20-89/16]

اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رَبّ نے میری اہانت کی O ایسا ہرگز نہیں بلکہ [بات یہ ہے] کہ تم [ہی] لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے O اور مسکینوں کے کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے O اور [مردوں کی] میراث سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو O اور مال کو جی بھر کر عزیز رکھتے ہو O

یعنی جب اللہ انسان کو تنگی میں مبتلا کر کے آزماتا ہے تو اللہ کے بارے میں بدگمانی کا اظہار کرتا ہے،، یعنی بات اس طرح نہیں ہے جیسے لوگ سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ مال اپنے محبوب بندوں کو بھی دیتا ہے اور ناپسندیدہ افراد کو بھی،، تنگی میں بھی وہ اپنوں اور بیگانوں دونوں کو مبتلا کرتا ہے، اصل مدار دونوں حالتوں میں اللہ کی اطاعت پر ہے جب اللہ مال دے تو اللہ کا شکر کرے، تنگی آئے تو صبر کرے،،،، یعنی انسان اُن کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں ،قرآن کے حساب سے وہ گھر سب سے بہترین ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے، اور وہ گھر بدترین ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جائے۔

سورہ نحل آیت نمبر 97 ستانوے جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرط کہ ہو وہ مومن اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے O قرآن کی یہ آیات اتنی واضح ہیں مجھے ان پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ [سورہ نحل 16/97]

جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے، اور ان کے نیک اعمال کا بہترین بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے O

مطلب یہ ہے کہ ایم مومن با کردار کو صالحانہ اور متقیانہ زندگی گزارنے اور اللہ کی اطاعت اور قناعت میں جو لزت و حالوت محسوس ہوتی ہے، وہ ایک کافر اور نارمان کو دنیا بھر کی آسائشوں اور سہولتوں کے باوجود میسر نہیں آتی، بلکہ وہ ایک گونہ قلق و اضطراب کا شکار رہتا ہے۔

قرآن کی ان آیات نے تو منہ ہی بند کر کے رکھ دیا ہے، میرا نہیں خیال کہ اتنی واضح آیات آجانے کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت در پیش رہ جاتی ہے البتہ بس اتنا ہی کہوں گا کہ انسان کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر شکر گزار رہنا چاہیے، رزق میں اضافے کے لئے اپنے سے غریب اور مسکین افراد کو اپنے رزق میں شامل کرنا چاہیے کبھی ناشکری کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے نیک عمال اور شکر گزاری رزق میں اضافہ کی سبب بنتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ہستی کو اپنے لئے سب کچھ سمجھنا چاہیے، تب ہی وہ ایسے ایسے راستوں سے رزق دے گا جدھر سے انسان کو گمان بھی نہ ہوگا، اللہ کیا اللہ کے احکام کی پیروری [عبادت] کریں اور اپنے اعمال کی اصلاح کریں جب رزق ہے ہی اللہ کے ہاتھ میں تو ہمیں اپنے اعمال صالح اور اللہ کے احکام کی پیروری، اللہ کی ہدایات پر عمل کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔

زندگی میں جب بھی کوئی حالت سامنے آتی ہے، چاہے وہ خوشی ہو یا غم، کامیابی ہو یا ناکامی، محبت ہو یا جدائی، انسان کا پہلا گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ کیفیت ہمیشہ رہے گی۔ غم میں گھرا ہوا انسان یہ سوچ لیتا ہے کہ اس کی تکلیف کا کوئی انجام نہیں، اور خوشی میں ڈوبا ہوا یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کا سرور ہمیشہ یوں ہی قائم رہے گا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وقت سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں۔ وقت ہر چیز کو بدل دیتا ہے۔ تمہارے سب سے گہرے دکھ کو بھی اور تمہاری سب سے بڑی کامیابی کو بھی۔ وقت نے کتنے بادشاہوں کو بھکاری بنا دیا اور کتنے بھکاریوں کو بادشاہ۔ وقت نے سب سے بڑی محبت کو محض ایک یاد میں بدل دیا اور سب سے بڑی جنگ کو صرف تاریخ کی کتابوں تک محدود کر دیا۔ یہی زندگی کا اٹل اصول ہے کہ کچھ بھی مستقل نہیں ہے۔

==

تمام قارئین سے گزارش ہے آپ سب کا سالانہ زرشرکت نومبر 2025ء میں ختم ہو گیا ہے، ذمہ داری کے ساتھ جلد از جلد ادا فرما دیں۔۔ تاکہ صوت الحق کی اشاعت میں خلل نہ آئے۔ مہنگائی کے سبب اس کی اشاعت میں بہت مشکلات کا سامنا ہے۔

شکریہ

محمد روشن عباسی

قرآن کا جن لوگوں سے تعلق ٹوٹ چکا

جن لوگوں نے دین میں فرقے پیدا کر لئے اُن فرقہ پرستوں کا قرآن سے تعلق ٹوٹ چکا ہے، یہ اعلان اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم سورۃ الانعام میں کر دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهُمۡ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ [الانعام۔6-159]

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں بس ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے، پھر ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے۔

اس آیت میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو اللہ کے دین کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے دین یا دوسرے طریقے کو اختیار کر کے تفرق وتحزب کا راستہ اپنا چکے ہیں۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ [6-160] قُلۡ اِنَّنِىۡ هَدٰٮنِىۡ رَبِّىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ دِيۡنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ [6-161] قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ [الانعام۔6-162]

جو شخص متوازن کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے اور جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہوگا O آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رَبّ نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ وہ ایک دین مستحکم ہے جو طریقہ ہے ابراہیم کا جو اللہ کی طرف یکسو تھے، اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے O آپ کہہ دیجئے کہ بالیقین میری صلاۃ اور میری فرمانبرداری اور میرا جینا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کا بیان ہے، اور اس کے ارتکاب کے بعد اس نے اس سے توبہ بھی نہیں کی یا اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب نہ آئیں، تو پھر اللہ تعالیٰ ایسی برائی کی سزا دے گا اور اس کے برابر ہی دے گا۔

لَا شَرِيۡكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ [الانعام۔6-163]

اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں O

قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِىۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ [6-164] وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَرَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ [الانعام۔6-165]

آپ فرما دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رَبّ بنانے کے لئے تلاش کروں حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا، پھر تم سب کو اپنے رَبّ کے پاس جانا ہوگا، پھر وہ تم کو جتلائے گا جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے O اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تا کہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں، بالیقین آپ کا رَبّ جلد سزا دینے والا ہے اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے O

یہ آیات آج کے انسان/مسلمانوں سے مخاطب ہیں یہ سب فرقہ پرست شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہلحدیث قرآن کی اس آیت کے مخاطب ہیں کیونکہ یہ سب گروہ گروہ ہو کر اس میں داخل ہیں جو اللہ کے دین کو اور قرآن کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے دین یا دوسرے طریقے کو اختیار کر کے تفرق و تحزب کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں،،، شیعا کے معنی فرقے اور گروہ، اور یہ بات ہر اس فرقے پر صادق آتی ہے جو دین کے معاملے میں مجتمع تھے لیکن پھر ان کے مختلف افراد نے اپنے کسی بڑے کی رائے کو ہی مستند اور حرف آخر قرار دے کر اپنا راستہ الگ کر لیا، چاہے وہ رائے حق وصواب کے خلاف ہی ہو

دین میں فرقے اور گروہ پیدا کرنیوالوں کے متعلق اُوپر میں فرمایا گیا کہ اُن کا تعلق قرآن سے ٹوٹ چکا ہے،، موجودہ مسلمان جو بے شمار فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہوئے ہیں، کیا غور کریں گے اُوپر کی آیت کی رُو سے ہم تو دائرے قرآن اُمت سے ہی نکل گئے ہیں، اور قرآن کے ساتھ اب مسلمانوں کا کوئی تعلق واسطہ ہی باقی نہیں رہ گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قرآن حکیم میں فرما دیا وہ اٹل ہے، لہٰذا نام نہاد مسلمانوں کو کسی غلط فہمی نہیں رہنا چاہئے، اور قرآن حکیم کی اُمت میں پھر نئے سرے سے واپس آنے کے لئے مسلمانوں کو تمام فرقوں، گروہوں اور طبقوں کو ختم کر کے اپنے آپ کو وحدتِ اُمت کی لڑی میں پرونا ہوگا، اور دیگر تمام ہستیوں اور کتابوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کی کتاب قرآن حکیم کی پیروی کرنی ہوگی ورنہ کچھ بھی باقی نہیں بچے گا،،، ان حقائق پر غور کیجئے سوچئے۔

شیخ راشد احمد

الربٰوا ازروئے قرآن کیا ہے؟ [1]

﴿ **الربٰوا ، البیع ، الصَّدَقٰتِ** ﴾

کچھ لوگ خیر سے اتنے ذہین فتنہ پرور ہوتے ہیں کہ ایک سیدھی سادھی بات سے فتنہ فساد کے وہ وہ نکتہ نکل لیتے ہیں کہ ابلیس بھی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے، **الربٰوا** سے متعلق قرآن حکیم میں ایک سادہ سا حکم ہے، جسے مسلمانوں نے اور خاص طور پر مذہبی پیشوائیت نے تختہ مشق بنا رکھا ہے، ابہام کا یہ حال ہے کہ قرآن میں نازل ہونے والے اس لفظ **الربٰوا** کا ترجمہ سود کر کے اس کے خلاف ہنگامہ کھڑا کیا ہوا ہے،،، سود حرام ہے، سود حرام ہے کی رٹ لگا رکھی ہے، جس کی صدائیں پوری دنیا میں گونج رہی ہیں۔

پہلے ہم لفظ ''سوڈ'' کو سمجھ لیتے ہیں، ہمارے گھروں سے عام طور جب کوئی شخص بازار جانے کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو کہتا ہے میں بازار ''سودا'' لینے جارہا ہوں،، بازار میں مختلف اشیاءِ ضرورت کے ''سوداگر'' ہوتے ہیں جن سے ہم ''سودا'' خریدنے سے پہلے ''سوداگر'' سے ''سودے بازی'' [بھاؤ تاؤ / کمی بیشی [Bargaining] کرتے ہیں،، ''سوداگر'' کو ''سوداگری'' سے یعنی اپنا ''سودا'' فروخت کر کے ''سوڈ'' ملتا ہے، جسے عام طور اُردو عربی میں نفع اور منافع کہتے ہیں،،، جب ''سوداگر'' اپنا ''سودا'' فروخت کر کے 'سوڈ' حاصل کرتا ہے تو وہ ''سوڈ'' حلال ہوتا ہے،، لفظ ''سوڈ'' قرآن حکیم کی نہ تو کوئی اصطلاح ہے نہ یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے، اس تمہید کے بعد ہم قرآن حکیم میں اللہ کے ارسال کردہ لفظ **الربٰوا** کو اسی مقام سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ ایک سیدھی سادھی سی بات اور اللہ کا حکم ہے،، جسے سازشی ذہنوں نے فساد کا ذریعہ بنا لیا ہے اور دین اسلام کو دنیا میں بدنام کرنے اور مذاق اُڑانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

کہتے ہیں یورپ اور امریکہ کا معاشی نظام / معیشت سود پر مبنی ہے، ہم دیکھ رہے ہیں تقریباً ویسا ہی معاشی نظام پاکستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ہے،، یہاں تک کے

جن ممالک میں کمیونزم نظام ہے مثلاً چین اور روس وہاں بھی نظام / معیشت کا اصول یہی ہے، کہ ضروریات زندگی کی اشیاءِ زمین سے اُگانا، پیدا کرنا یا چھوٹے بڑے کارخانوں میں تیار کرنا اور پھر وہ اپنے مال کو منڈیوں تک لاتے ہیں اور فروخت [sale] کر کے منافع کماتے ہیں،، کسی کے کاروبار کا حجم [سائز] چھوٹا ہو یا بڑا بالآخر کا مقصد مال [سودا] فروخت کر کے منافع [سود] کمانا ہوتا ہے اس منافعے کو انگریزی میں پروفٹ [Profit] کہتے ہیں، اس عمل میں تو الرِّبٰوا کا کوئی عنصر نہیں ہے، دنیا کے تمام ممالک ایسا ہی کر رہے ہیں جو جتنی معیاری اور سستی اشیاء تیار کر کے دنیا بھر کی عوامی منڈیوں تک پہنچا رہا ہے، وہ اتنا زیادہ منافع کما رہا ہے اور کامیاب ہے، یورپ، امریکہ سمیت دنیا بھر میں اسی کو معیشت کہتے ہیں، ضروریات زندگی کی اشیاء کے لین دین کو تجارت کہتے ہیں، اسی عمل سے زندگی کا پہیہ چل رہا ہے، اسی کو معاشی نظام، معیشت، کاروباری لین دین اور تجارت کہتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ اس پورے عمل میں **الرِّبٰوا** کا شائبہ تک نہیں ہے، جو ضروریات زندگی کی اشیاءِ زمین سے اُگائے گا وہ زمین سے حاسل کردہ پیداوار کو فروخت کرے گا، جو ضروریات زندگی کی اشیاء کو کارخانوں میں تیار کرے گا وہ اپنی تیار کردہ اشیاء کو دنیا بھر کی منڈیوں میں فروخت کرے گا اور اس سے منافع کمائے گا اس میں کہیں بھی **الرِّبٰوا** شامل نہیں ہے۔

بلکہ ہم تو جاگتی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ، امریکہ، جاپان، جرمنی اشیاء ضرورت بہت زیادہ معیاری، پائیدار اور افضانِ صحت کے اُصولوں پر تیار کر کے یہ ممالک عالمی منڈیوں میں آپنا سامان لاتے ہیں، ان کی تیار کردہ تمام اشیاء عوام میں بہت مقبول ہیں، لوگ ان کی فراہم کردہ اشیاء کو بہت پسند کرتے ہیں، اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں یہ تو تجارت [**البیع**] ہے، اس میں تو کسی مقام پر **الرِّبٰوا** کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اب مجھے کوئی یہ بتائے یورپ، امریکہ، چین، روس، جاپان اور جرمنی کی معیشت میں **الرِّبٰوا** کہاں ہے، یہ تو سیدھی سادھی تجارت ہے،، جو بھی سستی اور معیاری اشیاء بازار میں لا کر فروخت کرے گا، وہ زیادہ منافع کمائے گا، یہ تمام ممالک ایمانداری اور صفر نقائص [zero defect] سے پاک اُصول [Polacy] کو سامنے رکھ کر تجارت کر رہے ہیں، اور یہ تمام ممالک تجارتی پالیسی میں کامیاب ہیں، ہاں امریکہ کی معاشی نظام / معیشت کو ایک اور سہولت حاصل ہے کہ دنیا کی تمام

تجارت[Business] امریکن ڈالر میں ہوتی ہے اس لئے امریکہ کی معیشت زیادہ مضبوط ہے، امریکہ اپنے ڈالر کی طاقت کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ہم مسلمان بلاوجہ شور مچا رہے ہیں کہ ان کی معیشت **الرِّبٰوا** پر چل رہی ہے، نہیں بھائی غیر مسلم ممالک کا نظام معیشت تجارت[**البیع**] پر چل رہا ہے، مجھے کوئی مفتی، کوئی عالم، کوئی دانشور، کوئی معیشت دان یہ بتائیے اس عمل میں **الرِّبٰوا** کہاں شامل ہے؟ یہ عمل تو ہمارا اور غیر مسلموں کا تجارتی نظام/معیشت یعنی پاکستان، یورپ، امریکہ، چین، روس، جاپان اور جرمنی کا بالکل ٹھیک ہے اس میں تو **الرِّبٰوا** نہیں ہے یہ تو سیدھی سیدھی قرآن حکیم کے مطابق تجارت[**البیع**] ہے، تو پھر ہم کہاں اللہ کی بات کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں اور فتنے، فساد کا شکار ہو گئے ہیں، کس نے فساد کی اصل وجہ سے ہماری توجہ ہٹا کر **الرِّبٰوا** میں اُلجھا دیا ہے؟ ہمیں بڑی دانشمندی سے کس نے غلط پٹری پر چڑھا کر ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیا ہے، اور ہم معاشرے میں ہر طرف پھیلے ہوئے فساد کو **الرِّبٰوا** سے منسوب کرتے دیتے ہیں یا پھر یورپ اور امریکہ سے منسوب کر دیتے ہیں۔ جس آیت[2/275] کی بنیاد پر میں یہ عنوان زیر بحث لایا ہوں اس کے مطابق فی الحال دنیا کے کسی بھی ملک کا معاشی نظام/معیشت **الرِّبٰوا** پر نہیں ہے اور نہ **الرِّبٰوا** پر کبھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ معاشی نظام اور معیشت کی بنیاد تجارت[**البیع**] پر ہی ہوتی ہے۔

قرآن حکیم سورۃ البقرہ کی آیت **2/275** میں اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے صرف اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو انفرادی حیثیت میں اپنے سرمائے کو ضرورت مند، مساکین لوگوں کو اُدھار دے کر اپنے دام میں پھنسا لیتے ہیں ہمارے معاشرے میں اُن لوگوں سودخور کہا جاتا ہے، بھارت میں ایسے لوگوں کو بنیا اور مہاجن کہا جاتا ہے، انگریزی میں **usurer** کہتے ہیں، یہ دھندہ لوگ انفرادی حیثیت میں کرتے ہیں، دنیا میں کسی بھی مذہب کا کوئی بھی معاشرہ ہو، ان سودخور لوگوں کو ہر معاشرے میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے، یہ دھندہ کرنے والے ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو بھاری سود اور سخت شرائط پر معاشرے کے معاشی طور پر کمزور لوگوں قرضہ دیتے ہیں،، بھاری سود اور سخت شرائط کے عوض غریبوں کے مکان یا کوئی بھی قیمتی چیز ضبط کر لیتے ہیں، جس کے سبب سود پر قرض لینے والے غریب لوگ مزید بدترین زندگی کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ سودخور معاشرے کے بہت ظالم لوگ ہوتے ہیں،، سودخور اس دھندے سے کمائی

جانے والے پیسے کو اشیاءِ ضرورت کی تجارت سے حاصل ہونے ہونے والے منافع کی طرح سمجھتے ہیں اور اپنے دھندے کو تجارت[خرید و فروخت] کی طرح سمجھتے ہیں، اس کی توجیہی وہ یہ لاتے ہیں کہ یہ بھی ایک تجارت ہے دیگر تجارت کی طرح اس میں ہم اپنا پیسہ لگا کر منافع حاصل کرتے ہیں، جیسے ہر تاجر اپنا پیسہ لگا کر پیسے سے پیسہ اور منافع کماتا ہے ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں، اللہ نے قرآن حکیم میں ان لوگوں کے اس کام کو تجارت ماننے سے انکار کر دیا، اور کہا یہ تجارت نہیں یہ الربوا ہے اور اس مکروہ دھندے سے حاصل ہونے والا منافع حرام ہے۔

قرآن حکیم نے جن جگہوں پر[حاجت مندوں] کو صدقات دینے کا حکم دیا ہے،، اُن لوگوں کو اُدھار دے کر اُن سے منافع حاصل کرنے سے منع کیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ پابندی لگا دی ہے۔ اگر کوئی شخص ان لوگوں[والدین،،، یتیموں،، مساکینوں،،، قریبی لوگ، قربت کے رشتوں] کو اُدھار دے کر منافع حاصل کرتا ہے، تو ایسا شخص اللہ کا نافرمان ہے، اور اس کا یہ عمل اللہ اور اللہ کے پیغام[رسول] سے اعلان جنگ ہے۔ کیونکہ اس کا یہ عمل معاشرے میں ظلم، اذیت اور فساد پیدا کرتا ہے۔ اس طرح کی کمائی، آمدنی، منافع کو اللہ نے **الرِّبٰوا** کہا ہے، اللہ نے اس طرح کی کمائی، آمدنی، منافع، پروفٹ کو **البیع**[تجارت] سے خارج کر دیا ہے اور ایسی آمدنی کو حرام[ممنوعہ] قرار دیا ہے۔، معاشرے میں جن کی معاش کمزور ہو، حاجت مند ہوں اُن کو اُدھار دے کر اصل سے زائد وصول کرنا تجارت[**البیع**] نہیں ہے یہ **الربوا** ہے۔ اگر کوئی شخص معاشرے میں حاجت مندوں کی صدقات کے ذریعے مدد کرنے کے بجائے زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم لوگوں کو اُدھار دے کر اصل رقم سے زائد وصول کرئے یہ پیسے کمانے کا طریقہ کاروبار/تجارت/**البیع/Business** کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔۔ جاری ہے۔

۔۔۔اس عنوان کا بقیہ تفصیلی حصہ آئندہ ماہ پیش کیا جائے گا۔۔۔

===

تمام قارئین سے گزارش ہے آپ سب کا سالانہ زرشرکت نومبر **2025**ء میں ختم ہو گیا ہے، ذمہ داری کے ساتھ جلد از جلد ادا فرما دیں۔۔ تاکہ صوت الحق کی اشاعت میں خلل نہ آئے، مہنگائی کے سبب اس کی اشاعت میں بہت مشکلات آرہی ہیں۔۔ شکریہ

اورنگزیب یوسف زئی

تحقیقِ حیاتِ آخرت [9]

حیوانی وجود کی طبعی موت اور لافانی شعوری ذات

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

اختتامیہ

آیتِ مبارکہ ۸۴/۱۹: لترکبُن طبقاً عن طبقاً ۔ ترجمہ: تم لازماً طبق در طبق، یعنی مرحلہ در مرحلہ تشکیل پاؤ گے۔

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اس سیر حاصل تحقیق کے بعد آیئے اب موضوع کو اس کے منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے ایک طائرانہ نظر سے تمام تر جائزہ لے لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کائنات کے مختلف مراحل کی تخلیقی کاروائی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ تخلیق کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ حیات ایک بلندتر مرحلے میں داخل ہونے پر نہ ہی اُس خاص سطح سے کبھی نیچے آتی ہے، نہ ہی اُن اقدار میں سے کسی کو ضائع ہونے دیتی ہے جو اس مرحلے پر اس نے حاصل کی ہوں۔ مثلاً، تخلیق کے طبعی مرحلے پر اُس مرحلے کی وہ تمام شعوری اقدار جو زمین پر موجود طبعی قوانین کی شکل میں نمودار ہوئی تھیں، اپنے مرحلے کی تکمیل پر مکمل طور پر محفوظ ہو کر برقرار رہ گئیں۔ درحقیقت یہ قوانین زندہ سیارۂ زمین نے باریک ترین تفصیل کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ محفوظ کر لیے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم زمین کے عمل فعل یا طریقِ کار کی ادائیگی میں کوئی بھی سقم نہیں پاتے۔ اس کے بعد، نباتاتی حیات کی تخلیقی مرحلے پر ہر نسل کی شعوری اقدار ایک نوع کی شکل میں اس مرحلے کی مجموعی مقصد کے تحت، ایک بیج کی شکل میں مکمل طور پر محفوظ کر لی گئی تھیں۔ اس مرحلے پر حیات نے اپنی جسمانی ساخت اور شعوری اقدار یعنی رجحانات اور طریقِ کار، بیج کے اندر ایک سبب اور نتیجے کے تسلسل کی صورت میں محفوظ کر لی تھیں۔ ان اقدار کے برقرار رکھنے کا مقصد حیات کے تسلسل کو اس کے تمام بھرپور اور وسیع تنوع کے ساتھ یقینی بنانا تھا تا کہ وہ بلندتر تخلیقی مرحلے کے لیے ایک بنیاد کے طور پر کام کرے۔

اگلے تخلیقی مرحلے میں حیوانی حیات نے بھی اپنی اقدار کو ایک علیحدہ نوع کی طرح جرثومہ کی شکل میں برقرار رکھا۔ اس مرحلے میں حیوان نے جبلت کے دباؤ کے تحت کام کیا جو کہ سبب اور اس کے نتیجے کے اصول سے مماثلت رکھتا تھا۔ جانور کا یہ فیصلہ کہ وہ ایک مخصوص جبلت کے دباؤ پر حاوی آ کر دوسرے زیادہ طاقتور جبلی دباؤ کی تعمیل کرے، اس بات کی نشانی تھی کہ حیوانی مرحلے میں حیات، طبعی اور نباتاتی مراحل کے مقابلے میں زیادہ آزاد تھی۔ لیکن کیونکہ حیوانی مرحلے پر حیات مادی سطح پر ہی رہتی ہے اس لیے وہ خود سے آگاہ نہیں ہے۔ اگلے انسانی بلندتر مرحلے پر انسانی ذات ایک مختلف تخلیقی مرحلے میں رہتی ہے۔ اس لیے یہ اپنی شعوری اقدار اپنی ذات یا روح کے 'بیج' یا 'جرثومے' میں محفوظ کر لیتی ہے۔ سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ نوٹ کرنے والا ہے کہ انسانی شعورِ ذات سے قبل کے تمام تخلیقی مراحل میں ہر وجود نے شعوری اقدار ان کی نوعیت میں محفوظ اور منتقل کیں، ذات یا شخصیت میں نہیں۔ یہ اس لیے کہ اُن مراحل میں حیات خود سے یا اپنی شخصیت سے آگاہ نہ تھی اور مادی علامتوں یا اشکال میں زندہ تھی۔ اسی لیے یہ اپنی اقدار صرف اپنی نوع میں ہی ایک وجود سے دوسرے وجود میں منتقلی کے ذریعے محفوظ کر سکتی تھیں۔

حیوانی مرحلے تک حیات ایک سبب اور نتیجے کے تواتر کے ذریعے عمل پذیر تھی اور اس کا مکمل نظام خود حیات نے مادی علامتوں کی شکل میں بیج یا جرثومے کی صورت اپنے تسلسل کے لیے محفوظ کیا تھا۔ مثلاً نباتاتی مرحلے پر ایک آم کے درخت کی منفرد شناخت اس کی نوع اور نسل میں ہوتی ہے، اس کی ذات میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ خواہ ایک آم کا درخت ہو یا ایک گندم کا پودا،

پودوں میں حیات کبھی خود شناس نہیں ہوتی، اور اس سبب سے یہ کم وبیش ایک میکینیکل سطح پر ہی، سبب اور نتیجے کے اصول پر کام کرسکتی ہے۔ [یہاں یہ واضح کردیا جائے کہ اس کائنات میں کچھ بھی میکینیکل یا خودکار نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ایٹم بھی حیات رکھتا ہے اسی لیے یہ اُس تعلق سے عمل کرنے میں آزاد ہے۔ آزادی اور علم شعور کے اوصاف ہیں۔ جتنا زیادہ حیات اپنے مقصد سے آگاہ ہوگی، اتنا ہی زیادہ وہ خود سے عمل کرنے مین آزاد ہوگی۔] اس لیے نباتاتی مرحلے میں ہر نسل سختی سے اپنی شعوری اقدار کے حصول کے لیے زندہ رہتی ہے اور انہیں مکمل طور پر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں برقرار رکھتی ہے۔ یہ اسی خصوصیت کی وجہ سے ہے کہ ہر نسل ایک ٹریڈ مارک کی مانند اپنی صورت اور اقدار کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی کی مانند معاملہ حیوانات کے تخلیقی مرحلہ کا بھی ہے۔

حیوانی مرحلہ بھی ایک مادی مرحلۂ حیات ہے اور یہ اپنی نسلوں کی شعوری اقدار، نوعیت کے حساب سے اپنے مرحلے کے مجموعی پلان کے تحت قائم رکھتا ہے۔ خواہ یہ ایک گھوڑا ہو یا ایک میمنا، ہر ایک اپنی اقدار ایک نوع یا نسل کے پیمانے میں برقرار رکھتا ہے۔ طبیعی جسم کو شعوری اقدار تشکیل دیتی ہیں، اور شعوری اقدار اسی وجود کی شکل میں زندہ رہتی ہیں۔ دونوں حالتوں میں حیات زندہ رہتی اور طبیعی وجود کو غیر شعوری طور پر متنوع علامات کے ذریعے کنٹرول کرتی ہے۔ اور یہ سب سبب اور نتیجے کے تسلسل کی پیروی کرتے ہیں۔ بمقابلہ نوعی اقدار کے جو نوع کی شکل میں ان مراحل میں محفوظ کی جاتی ہیں، وہ اقدار جو انسانی مرحلے میں محفوظ رکھی جاتی ہیں وہ شخصی یا ''ذاتی'' ہیں جیسا کہ لفظ ''شعوری ذات'' کے ذریعے زور دیا گیا ہے۔ اگر ہم شعوری ذات کو خارج کردیں، تو انسانی مرحلے میں ذات یا شخصیت سے متعلق کوئی بھی شعوری اقدار موجود ہی نہ رہیں گی یا خود کو بچا نہیں پائیں گی۔ اس طرح انسانی مرحلے میں شعوری اقدار ہر فرد کے ساتھ یا شعوری ذات کے ساتھ ''ذاتی'' ہی رہنی چاہییں۔

ماحصل

ہماری اس بحث سے یہ بات صاف ہوگئی کہ

[اولاً] انسانی ذات اپنی ذہنی جسم یا ذہنی حالت میں خود مختار زندگی گزارتی ہے؛ اور

[ثانیاً] انسانی ذات مر نہیں سکتی نہ ہی یہ ایک ذات سے دوسری ذات میں اُس طرح منتقل ہوسکتی ہے جیسے پودوں اور حیوانات کی طبیعی حیات، کیونکہ انسانی ذات ایک یگانہ ومنفرد خود آگاہ ہستی کی طرح زندہ رہتی ہے۔

انسانی مرحلے میں صرف طبیعی جسم کی شعوری اقدار ہیں جو قابلِ انتقال ہیں اور جو موت اور ٹوٹ پھوٹ سے عبارت ہیں۔ لیکن انسانی ذات جو ایک بالکل علیحدہ غیر مادی حالت میں رہتی ہے، قطعاً مر نہیں سکتی کیونکہ یہ تخلیقی طریقِ کار کے بنیادی قانون کے خلاف ہے جس کے مطابق حیات اپنی حاصل کردہ سطح سے نیچے نہیں آسکتی اور نہ ہی یہ اپنی شعوری اقدار کو ضائع کرسکتی ہے۔

زندگی یا حیات لازماً اپنی نہایت مشکل سے حاصل کردہ اقدار کا تحفظ کرتی ہے، اپنی تمام باریک ترین تفاصیل کے ساتھ، کیونکہ بصورتِ دیگر تخلیقی طریقِ کار مزید آگے نہیں بڑھ سکتا۔

خود شناسی کے مرحلے سے قبل کے تمام تخلیقی مراحل دراصل شعوری ذات یا انسان کے ہی تخلیقی مراحل تھے۔ کیونکہ وہ شعوری اقدار جو شعورِ ذات کے تخلیقی مرحلے سے قبل پیدا کی گئیں، ابتدائی مراحل تھے اور خود آگاہ انسان کے نمودار ہونے کی راہ ہموار کرنا ان کا مقصد تھا، اس لیے وہ سب ایک غیر شعوری یا مادی حالتِ حیات میں رہتے تھے۔ اس حالت میں حیات جو خود سے آگاہی نہیں رکھتی تھی، پیدائش کے طریقِ کار پر ترقی پاتی اور منتقل ہوتی رہی۔ انسانی مرحلے پر پہنچ کر حیات اپنے خالق کے وجود سے براہِ راست آگاہ ہوگئی اور اپنے ماخذ کی پہچان کے ذریعے یہ اپنے آپ میں آداخل ہوئی۔ پھر انسان کے تمام اعمال وافعال اس کی شعوری ذات کے ذریعے سرانجام پانے لگے اُس مقصود کے ساتھ کہ اُس حقیقتِ مطلق کو زیادہ سے زیادہ دریافت کیا جائے جس نے انسان کو خود سے آگاہی دی تھی۔

ایک اور نظریے کے مطابق بھی آدمی مرتا نہیں ہے۔ حقیقت کے اس کے باطن سے جھلکنے کے ساتھ انسانی ذات خود کو پہچاننا شروع کردیتی ہے۔ یہ ہمیشہ کسی دوسری حقیقت کے حوالے سے ہوتا ہے کہ انسانی ذات خود کو جان سکے۔ اس طرح، ایک مرتبہ اپنی ذات کی پہچان ہو جائے تو پھر انسانی روح یا شعوری ذات کوئی تبدیلی قبول نہیں کرسکتی۔ حتٰی کہ موت یا تباہی بھی روح پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ ذات کی موت کا مطلب ہوگا حقیقتِ مطلق کی موت یا اُس ماخذ کی موت

جس کی وجہ سے ذات پیدا ہوئی اور خود کو جاننے لگی۔ یہ امر ہمیں مزید اس نتیجے کی طرف لے جاتا ہے کہ انسان کی شعوری ذات ایک ایسی حقیقت ہے جو ایک مرتبہ اپنے ماخذ کو جان لینے کے بعد یعنی ''دوسری حقیقت'' کو جاننے کے بعد، کبھی بھی تباہ نہیں ہو سکتی۔

شعورِ ذات کے مرحلے پر ذات اپنی تمام سوچوں اور اعمال کو باریک ترین تفصیل کے ساتھ اپنے ذہنی آلات میں محفوظ کر لیتی ہے۔ اسی بناء پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بے شک حیوانی وجود مستقلاً تبدیلی سے گذرتا رہتا ہے، لیکن انسانی ذات یا شخصیت اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ انسانی ذات اگرچہ اپنی پیدائش سے بوڑھاپے تک، حیوانی وجود کے ساتھ منسلک ہے، تاہم یہ اپنے تصورات، سوچ وفکر اور اعمال وافعال کو بطور ایک منفرد شخصیت خود مختار طریق پر محفوظ رکھتی ہے۔ اگر شعوری ذات بھی کسی تبدیلی کا ہدف ہوتی تو اس کی سوچ وفکر اور افعال کبھی ریکارڈ ہو کر محفوظ نہ رہتے۔

اس حقیقت کو کہ انسان کی شعوری ذات نہایت احتیاط سے اپنی سوچ وفکر اور افعال کو محفوظ کر لیتی ہے، نامور نفسیات دان، فرائڈ کی تائید وحمایت حاصل ہے جس نے انسانی ذہن پر ایک تسلسل کے ساتھ تجربات کے نتیجے میں یہ دریافت کیا۔ یہاں اس نکتہ کی وضاحت کر دینا چاہیے کہ فرائڈ کی اصطلاح ''id'' یا ''لاشعور'' جو اس نے انسانی ذہن یا ذات کے متعلق استعمال کی، وہی ہے جسے ہم ''شعوری ذات'' کہہ چکے ہیں اور جو ہماری تحقیق کے مطابق انسان کی تمام شعوری کاروائیوں کو محفوظ رکھتی ہے۔

فرائڈ لکھتا ہے: '' id میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کا موازنہ عدم [لا ۔ negation] سے کیا جائے اور ہم اس میں فلاسفروں کے اُس اصرار سے، کہ زمان ومکان ہمارے افعال کا ایک ضروری حصہ ہیں، استثناء کی کیفیت دیکھ کر حیران ہیں۔ کیونکہ id میں ایسا کچھ نہیں ہے جو وقت کے تصور سے تعلق رکھتا ہو۔ اس میں امتدادِ زمانہ کی کوئی پہچان یا شناخت نہیں ہے [اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو بہت ہی قابلِ ذکر ہے اور فلسفیانہ فکر میں خاطر خواہ توجہ کی منتظر ہے] اور وقت کے گذرنے پر ذہنی طریق کار میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ذہن کے وہ تخلیقی رجحانات جو کبھی id کی طرف جبراً دھکیلے بھی نہیں گئے، اپنی اصل میں لافانی ہیں اور

دہائیوں تک وہاں اس طرح برقرار رہتے ہیں جیسے وہ ابھی حال ہی میں واقع ہوئے تھے۔''

فرائڈ کے اس تحیر کا جواب، کہ ہر ایک واقع id میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کاروائی میں وقت کے تصور سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا، بہت ہی سادہ ہے۔ id، یا لاشعور، کا واقعات کو محفوظ کر لینے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب حیات خود کو حیوانی وجود کی موت پر اس سے علیحدہ کر لے تو اس کے بعد بھی اس کا تسلسل یقینی رہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ زمان ومکان کے قوانین صرف اسی کائنات پر منطبق ہوتے ہیں۔ اگر اس کائنات کے علاوہ جسے ہم جانتے ہیں، کوئی اور بھی کائنات موجود ہو، جیسا کہ سائنس فی زمانہ ہمیں multiverse کی تھیوری کے ذریعے اشارہ دے رہی ہے، تو وہ یقیناً اس کائنات کے زمان ومکان کے نظام سے باہر اپنا وجود رکھتی ہوگی۔ ہماری موجودہ زندگی میں ہمارا ہر عمل زمان ومکان کے نظام کے اندر ہی بار آور/ بارز ہوتا ہے جو ایک ایسا نظام ہے جو اضافی ہے۔ لیکن اگر فرائڈ کے مطابق، ہم ضرور ایک ایسی ذہنی حیات رکھتے ہیں جو زمان ومکان کے اثر سے آزاد ہے، تو یہ ہمارے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ انسانی ذات طبیعی وجود کی موت کے بعد بھی زندہ رہنا جاری رکھے گی۔ طبیعی وجود کی موت تو بذاتِ خود زمان ومکان کے اثر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن یا ذات زمان ومکان کی اقلیم سے بلند رہتی ہے، جیسا کہ فرائڈ نے بھی اپنے تجربات سے دریافت کیا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ذات کو موت نہیں آسکتی؛ یہ صرف طبیعی وجود کو آتی ہے جو ایک مادی حالت میں زندہ ہے اور زمان ومکان کی حدود کا اسیر ہے۔

یہاں پھر ایک بار حضرت علامہ اقبال کی فکرِ عمیق سے کچھ جواہر پارے پیش ہیں جو ہمارے موضوع کو اجاگر کرتے ہیں:

''ارض وسماء، پستی وبلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے۔ جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان ومکان [time and space] کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائیگا۔ کیا معلوم ارض کیا ہو اور سماء کیا ہو۔ یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لیے تو فرمایا کہ [۱۴/۴۸: یومَ تُبدّلُ الارضُ غیرَ الارضِ والسمٰوٰت۔ جس دن یہ ارض وسماوات بدل جائینگے]۔ شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان ومکان کے بُعد باقی نہ رہیں۔ خواب میں

دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں۔ نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔''

قارئین، یہاں حضرت علامہ مراحلِ حیات کے تناظر میں درجہ بدرجہ بلند تر ہوتی ہوئی شعوری اقدار ہی کی بات کر رہے ہیں اور اس امر کے امکان کی تصدیق فرماتے ہیں کہ آئندہ مرحلہِ حیات زمان ومکان کے قوانین سے ماوراء اور بلند تر سطح پر قائم ہوگا۔

ذات یا شخصیت کا واقعات اور خیالات کو محفوظ کر لینا مزید ظاہر کرتا ہے کہ وہ ساز و سامان یا وہ نظام جس کے ساتھ ذات قریبی طور پر وابستہ ہے، طبیعی وجود کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں زیرِ بحث لایا گیا، یہ اس وجہ سے ہے کہ طبیعی وجود مسلسل تبدیلی کی زد میں رہتا ہے۔ ہر تین سال بعد وجود کے خلیات مکمل طور پر نئے خلیات سے بدل جاتے ہیں اور بعد ازاں ایک خاص عمر تک پہنچنے پر وہ زوال اور شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں اور آخر کار وجود کے بکھر جانے پر منتج ہوتے ہیں۔ تاہم، ہم ذات کے ذہنی نظام میں کوئی تبدیلی یا کمتری کا رجحان نہیں پاتے ، جہاں فرائڈ کے مطابق دہائیاں گذر جانے کے بعد بھی تمام واقعات، خیالات اور اعمال اس طرح محفوظ کر لیے جاتے ہیں گویا کہ ابھی حال ہی میں واقع ہوئے ہوں۔

آخری فیصلہ

قارئین، ہم حیات کے اہم ترین پہلوؤں پر تحقیق کر چکے ہیں اور نتیجتاً کچھ بہت اہم فیصلوں تک پہنچے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نباتاتی اور حیوانی مراحلِ تخلیق پر حیات کی شعوری اقدار بیج اور جرثومے کی صورت میں محفوظ کی گئی ہیں۔ اور یہ کہ اقدار کے اس تحفظ کا مقصد اُن مراحل میں حیات کے تسلسل کو یقینی بنانا تھا۔ اُن مراحل میں حیات قابلِ انتقال تھی کیونکہ حیوانی مرحلے تک حیات ابھی خود سے آگاہ نہ تھی اور اسی لیے مادی حالتوں میں موجود تھی۔ یہ اپنی اقدار صرف عملِ پیدائش کے ذریعے بچا سکتی تھی۔ تاہم انسانی مرحلے میں انسانی ذات نا قابلِ انتقال تھی۔ اسی لیے یہ اپنے اُس حیوانی وجود کی موت کے بعد بھی حیات کا تسلسل قائم رکھ سکتی تھی جو تبدیل ہونے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانے کا ہدف تھا۔

نباتاتی اور حیوانی مراحل میں حیات خود آگاہ نہ تھی اور اس لیے ایسی اکائیوں کی تنظیم

میں رہتی تھی جو طبیعی وجود کے ذریعے اپنی اقدار بآسانی منتقل کر سکتی تھیں۔ مثلاً، نباتاتی مرحلے میں پودے کا بیج مکمل پودے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوانی مرحلے میں جرثومہ مکمل طور پر حیوان کی جبلی اور شعوری اقدار کو محفوظ رکھتا ہے اور دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ انسانی مرحلے میں اگرچہ انسان کا طبیعی وجود بھی جرثومہ کے ذریعے دوبارہ پیدا ہوتا ہے، مگر شعوری ذات جو اپنی ذہنی حالت میں رہتی ہے اور حیوانی وجود سے بالکل الگ ہے، نہ دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی بیج یا جرثومے کے ذریعے منتقل ہو سکتی ہے۔ شعوری ذات ایک یگانہ ہستی کے طور پر نمودار ہوتی ہے جہاں اس کے تمام خیالات، نظریات اور اعمال مکمل محفوظ رہتے ہیں جیسے کہ درخت کے پتّے، ٹہنیاں اور تنا بیج کے اندر رہتا ہے۔ تخلیق کا اولین اصول ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حیات اپنی سطح سے نہ کبھی نیچے آتی ہے اور نہ ہی اپنی اقدار کو کھوتی ہے۔ اس لیے ہر ذات اپنی شعوری حیات کو محفوظ رکھتی ہے۔ شعوری اقدار کا تحفظ لایعنی ہو جاتا ہے اگر اس کا مقصد حیات کا تسلسل قائم کرنا نہ ہو۔ پس انسانی ذات مر ہی نہیں سکتی۔ یہ حیات کے تخلیقی طریق کار ہی کے خلاف ہے۔

انسانی مرحلے سے قبل کے تمام مراحل کا مقصد خود آگاہ ذات کی تخلیق تھی۔ سابقہ مراحل میں حیات نے تبدیل اور تعمیر ہونے کا عمل قدم بہ قدم جاری رکھا۔ اُن تبدیلیوں کا مقصد، نیز موت اور پیدائش کے سلسلے کا مقصد، پیہم تلاش کرنے اور حقیقتِ مطلق تک پہنچنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر مرحلے میں حیات غیر معینہ طور پر جاری رہتی اور اس طرح بذاتِ خود ایک وجود کی حیثیت سے اُبھر آتی۔ اس لیے ہم یہ حقیقت نظر انداز نہیں کر سکتے کہ تمام سابقہ مراحل ، یا دوسرے الفاظ میں، تمام کائنات اس لیے بنائی گئی کہ انسان کی تخلیق ہو سکے۔ اپنے ماخذ کو پہچان لینے کے بعد، حیات انسان کے اندر اپنے خالق کے اظہار کے طور پر ابدی قیام کرنے آ گئی، جہاں وجود کی طبیعی موت درحقیقت اس کے لیے حیات کے نئے اُفق کھولتی ہے جو خواہشات اور کشش سے پُر ہوتے ہیں۔

انسانی ذات یا روح ابھی بھی تکمیل کے مراحل میں ہے،،،،،،، اقبال کے الفاظ میں:

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل، ترا نقش ہے ناتمام ابھی

،،،،،،،، اور جب تک خالق خود کو انسان کے اندر اپنے متعین کردہ انداز میں پوری طرح بارز

نہیں کر لیتا،شعوری ذات پابند ہے کہ جدوجہد کرتی رہے اور اپنے خالق کی صفات زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرے اوراس طرح اس کے قریب تر پہنچ جائے۔

زندگی صرف صحیح آئیڈیل کی پیروی میں ہی آگے بڑھ سکتی ہے۔

طبعی وجود کوترک کر دینے کے بعد انسانی روح یا ذات اپنی خالص نفسیاتی یا روحانی حالت میں منتقل ہو جاتی ہے۔تاہم روح اپنی نفسیاتی دنیا کی تعمیر صرف اُن اعمال کی روشنی میں کر سکتی ہے جواس نے اپنی موجودہ حیات میں سرانجام دیے ہوں۔انسان اپنے آئیڈیلز کے ساتھ زندہ ہے۔حتی کہ وہ بھی جو اپنے اس اندرونی نفسیاتی تقاضے کا انکار کرتے ہیں، پہلے ہی اپنے آئیڈیل کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں،خواہ اُن کا آئیڈیل کمتر ہو یاایسی منفی اقدار پراساس رکھتا ہوجن کی بنیاد اپنی ذات کومکمل نظرانداز کرنے پر ہو۔ذات بہرحال ایک دائمی تسکین تبھی حاصل کر سکتی ہے جب اس کا آئیڈیل اُس کے اپنے ہی صفات پرمبنی ہو۔ یہ اس لیے کہ حقیقی تسکین کبھی حاصل نہیں ہوسکتی اگرآئیڈیل ان معیاروں اورصفات سے محروم ہو جو ذات یاروح میں نقش ہیں ۔مثلاً انسانی ذات آزادی کی حامل ہے۔یہ فیصلے کرتی ہے اور یہ خود سے آگاہ ہے۔یہ محبت اور کشش کے وصف رکھتی ہے اور یہ لامحدود سے بھی آگاہ ہے۔اسی کے مطابق صحیح آئیڈیل لازماً انہی صفات کا حامل ہونا چاہیئے جو روح میں موجود ہیں۔اس سےہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ صرف ایسے آئیڈیل یانظریے جوانسانی ذات کی صفات پرمبنی ہوں،ذات کوخود کی شناخت دے کرتسکین دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

آئیڈیل، یا قابلِ تقلید تصوراتی پیکر،انسانی ذات کا نصف ہے اور یہ روح میں اُن دو اجزاء کی مانند رہتا ہے جو ایک بیج کی اکائی میں رہتے ہیں۔اگر ہم آئیڈیل کو زندگی سے نکال لیں، انسانی ذات قائم نہیں رہ سکتی۔یعنی یہ خود کو کبھی جان ہی نہیں سکتی۔

اگرچہ انسانی تقاضہ اُس خالق کی تلاش اور اُس سے محبت ہے جس کا عکس وہ خود کے اندر پاتا ہے، پھر بھی وہ ابھی تکمیل کے سفر میں ہے۔اور وہ اپنی آزادی کے تحفے کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔اور کچھ غلط آئیڈیل منتخب کر کے ان کی پیروی اختیار کر سکتا ہے۔انسان کو خالق نے اپنے پیغام بروں اور انتہائی باشعور انسانوں کے ذریعے راہنمائی مہیا کی ہے جنہیں اُس نے تخلیقی طریق کار کے تحت پیدا کیا ہے۔اس لیے وہ لوگ جو مختلف نظریات کا اتباع کرتے ہیں دراصل انسانوں

کی ایک مختلف صنف کی حیثیت میں زندہ ہیں۔تخلیقی طریقۂ کار کے مطابق صحیح نظریہ صرف ایک ہی ہے،ایسے ہی جیسے کہ سچائی صرف ایک ہی ہوتی ہے،لیکن جھوٹ کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا شعوری روشنی کا آئندہ مرحلہ ان روحانی اقدار پرتعمیر یا شروع ہوگا جو صحیح نظریے کے متبعین نے حاصل کی ہونگی۔تمام دوسری اصناف کو ایک طبعی نتیجہ کا سامنا کرنا ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں وہ جو موجودہ مرحلہ حیات میں اندھے رہے اُس روشنی کو نہیں دیکھ سکیں گے جو آئندہ آنیوالے بلندتر مرحلے میں نمودار ہوگی۔،،،،،،،،خالق کا فرمان ہے:

’’۱۷/۷۲: ومن کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ۔۔۔‘‘۔ ترجمہ: جو اس زندگی میں اندھے رہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھے ہی ہونگے۔

ایسے لوگوں کوخود کواُس شعوری روشنی تک پہنچنے کے قابل بنانے کے لیے سخت ذہنی اور روحانی اذیت سے گزرنا ہوگا۔یہ اس دنیا میں اُن بہت سی حیوانی اصناف کی مانند ہیں جوشعوری طور پراندھی ہوتی ہیں،اگراُس شعوری روشنی سےاُن کا موازنہ کیا جائے جو انسان کوعطا ہوئی ہے۔

غلط نظریات جو انسانی ذات کی روحانی اقدار کی نفی کرتے ہیں، انسانی ذات کو اندھا رکھتے ہیں۔ایسے نظریات کے پیروکار تخلیق کے اُلٹے طریقِ کار[Reverse process] پر یقین کرتے ہیں،یعنی وہ خود کو مادی قوتوں کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ یہ وہ انسان ہیں جو اپنی روحوں یا ذات کو ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اتار دینے کا نظریہ یا رجحان رکھتے ہیں اوراس وجہ سے وہ آئندہ مرحلے کی روحانی اقدار کوکبھی حاصل نہ کر پائیں گے۔،،،،،،،،خالق کا فیصلہ تو یہ ہے:

’’۲/۱۶۷: وما ھم بخارجین من النار‘‘۔۔۔ ترجمہ: پھر وہ کبھی اُس آگ سے باہر نہ آسکیں گے۔،،،،،،،،یہ تخلیقی عمل کا بنیادی اصول ہے کہ حیات صحیح شعوری اقدار پرشروع ہو اور پیش قدمی کرے۔ اگلے مرحلے کی شعوری روشنی خالق کی عظمت وشان کی روحانی روشنی ہے۔اور اس طرح انسانیت کا صرف وہ حصہ جس نے خالق پر بھروسہ کیا،اُسی کی ذات کو اپنا مطلق آئیڈیل بنایا،اوراپنی ذات کی دُرست سمت میں افزائش کی،آئندہ بلندتر مرحلے میں شان وعظمت کی روشنی دیکھ سکے گا۔

لہٰذا ان لوگوں کے لیے یہی درست وقت ہے جنہیں اس دنیاوی زندگی کا تحفہ ملا ہے کہ وہ زندگی کے آئندہ سفر میں ایک ہموار پیش قدمی کرنے کے لیے صحیح نظریے کا انتخاب کریں۔

علامہ نے اپنی فکرِ عمیق سے انسانِ کامل کے لیے ایک معیار متعین فرمایا تھا۔ براہِ کرم لفظ کافر کو انتہائی معنی میں تحقیر کی بجائے نظریاتی تناقض میں لیتے ہوئے غور فرمائیں، ممنون ہوں گا:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

والسلام۔۔۔۔اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔

بقیہ: روایت اور معجزہ کی حقیقت

محاذ جنگ قائم کیا اور مذہب کے درندے نے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگین رہے برنو (Bruno) کے خلاف اپنا چنگل بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کروں کا بھی قائل تھا۔ اسے کافر ملحد قرار دے کر سات سال کے لئے قید کرلیا گیا کہ وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اُس نے کہا کہ حق بات سے انکار کیوں کر کرے تب آخر کار پا بہ زنجیر اسے قتل گاہ میں لے گیا اور بہت سی لکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگادی گئی اور وہ جل کر راکھ ہوگیا۔ الغرض مذہب نے عقل وعلم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایک بار اکھڑ جاتے ہیں تو پھر مشکل سے جمتے ہیں۔ عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی۔

جانبازانِ علم اٹھے اور انہوں نے سمندروں، پہاڑوں، اور وادیوں میں جانیں دے دے کر وہ وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں۔ انہوں نے بخار اور برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو دیوتا بنا دیا، لیکن اہل مذہب بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے مذہب والے مفروضہ معجزے بیان ہی کرتے رہے اور انہوں نے انہیں پورا کر دکھایا۔ یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کر سکے تھے اسے علم وعقل نے پورا کر دکھایا۔

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز۔ ایک لامحدود ہستی کا وجود ایک لامحدود و استحالہ عقلی ہے کائنات کے تمام مظاہر و ماثر اسباب ونتیجہ سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا۔

علامہ نیاز فتحپوری

روایت اور معجزہ کی حقیقت

زندگی کا صحیح مقصود حصول مسرت ہے اور ذہن انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب وشرائط معلوم کرے۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں محض جسمانی راحت وآسائش نہیں، بلکہ بلند قسم وہ مسرت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے، جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد حاصل محسوس ہوتی ہے، جو فطرت کے مطالعہ اور حسن مجرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے، اور جو آزادی ذہن اور ضمیر کی پیداوار ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے، جو حریت فکر وآزادیٔ رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور جس نے عقلِ انسانی کو شل کر دینا ہی اپنی مقصود زندگی قرار دے رکھا ہے۔ یہ گروہ اپنے آپ کو اہل مذہب اور روحانیت پرست کہتا ہے۔ یہ گروہ وہ ہے جو احساسات مسرت کو وسوسہ شیطانی کہتا ہے، یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے، جس کا اصطلاحی نام اس نے حیات بعد الموت رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی تسبیح وتحلیل کے لئے منتخب کرلیا ہے، پیام ربانی کے لئے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت اور حقیقت کا نام ہے صرف اس چیز کا جو اس کے دل ودماغ سے پیدا ہو۔

اس جماعت نے ہمیشہ عقل وعلم سے دشمنی کی، ذہن انسانی کو ہمیشہ اس نے کند رکھنا چاہا اور اس نے علم ویقین کا ماخذ ہمیشہ غیر فطری معجزات وکرامات کو قرار دیا ہے۔ اس لئے دنیا میں صرف نفرت و تعصب اور خوف کی اشاعت کی۔ اس نے منکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا، اس نے محنت اور عمل سے ہمیشہ جی چرایا اور اسی کو برگزیدہ قوم سمجھا جس کے لئے غیب سے من وسلویٰ نازل ہوسکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے جسے عقل انسانی کبھی تسلیم نہیں کرسکتی۔ اس میں تخلیق کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینش انسان کا بھی، اس میں تاریخ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی، لیکن با ایں ہمہ یہ محض روایت اور داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یا

پھران ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار ہے۔

انہوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قائم کیا، انہوں نے ہمیشہ دنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شامل حال نہ ہو تو بارش بند ہو جائے، کھتیاں برباد ہو جائیں، دنیا قحط اور وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی نوع انسانی پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو انہوں نے اس کو اپنی ہی دعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انہوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جب کبھی اقتدار حاصل ہوا۔ علم کو روندا گیا، عقل پامال کی گئی، آزادی کو مٹایا گیا، مفکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ ارباب فضل وکمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔

لیکن مذاہب کا ظہور مذہبی کتابوں کی پیداوار خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہد وحشت کے غاروں سے لے کر موجودہ دور تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے۔ دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے نہ اس میں معجزہ وخرق عادات کو کوئی دخل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو، ہر شے اور ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ تو بالکل فطری خیال تھا کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ اس کو سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے۔

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دیکھتا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ پانی کیوں برستا ہے، درختوں کا نشو ونما کیوں ہوتا ہے، بادل کیونکر معلق فضا میں اڑتے ہیں، ستاروں کی چمک کہاں سے آتی ہے، چاند سورج کو کون اِدھر سے اُدھر لے جاتا ہے، وہ سوچتا تھا کہ یہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا۔ بیداری کے بعد نیند کیسی، روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا۔ زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانی دیکھ کر وہ لرزابراندام ہو جاتا تھا اور چونکہ وہ ان کے طبعی حدوث کے اسباب سے ناواقف تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم الشان ذی حیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظرہ مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انہی کو وہ دیوتا یا دیویاں سمجھ کر ان سے مدد لینے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا۔

طلوع صبح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین جمیل دیوی ہے، آفتاب کو اس نے ایک جگنو عاشق مزاج دیوتا تصور کر لیا۔ رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مغنی، جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا اور خزاں کو ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چن کر لے جاتی ہے۔ الغرض اسی طرح کے سینکڑوں تعبیریں ہزاروں تفسیریں اس نے مناظر فطرت اور حوادث طبع کی اپنی

ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جان کر پھیلانا شروع کیا۔ اقوام عالم کی روایات مذہبی یا اساطیراو لین پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد یکسرا نہی شاعرانہ تفسیروں اور اسی قسم کے قیاسات ضعیفہ پر قائم ہے۔ چنانچہ باغ عدن کی روایت کو دیکھئے کہ وہ دنیا کے ہر قوم میں پائی جاتی ہے کیونکہ وہ مصائب سے گھبرا اٹھی تو اپنی تسکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے۔

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں قریب قریب پائی جاتی ہے ۔انہوں نے گھونگھے سپیاں اور لہروں کے نشانات سے پہاڑوں وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا میں طوفان آیا تھا۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اس کے کتنے اندیشے کتنی امیدیں کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولیں مذہب آفتاب پرستی تھا اور بالکل فطری بات تھی کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے اور اس سے زندگی میں حرارت قائم ہوتی ہے ۔اپالو بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دے کر بھگا دیتا تھا۔ اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر جھونپڑے کی حفاظت کرتا تھا، کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرین بھرے ہو گئے۔ ہرقولس بھی سورج دیوتا تھا، جونا دیونس بھی وہی تھا، اور یہ سب کے سب 25 دسمبر کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا اور سب غیر طبعی موت مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی سب کچھ وہی ہے۔ 25 دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے ہیروڈ نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکے میں ہلاک کیا (چالیس کا عدد مذاہب کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے) طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی، موسیٰؑ چالیس دن کوہ سینا پر رہے، چالیس سال تک بنی اسرائیل صحراؤں میں پھرتے رہے، چالیس دن کا روزہ رکھا غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰؑ بھی سورج تھے اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتداء آفتاب پرستی سے ہی ہوئی، چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کر لینا اسی زمانے کی یادگار ہے۔ کیونکہ وہ سورج کو نہ دیکھ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ جب ہم امم سابقہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس زمانے کے مذاہب میں کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی ان کے تمام مراسم اور عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ نوع کی رسم پائی جاتی ہے لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندوؤں، مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں بھی پانی کا وجود پایا جاتا تھا۔ صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی زندگی کی اگنی کی۔ قبر انسانی پر صلیب، اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قائم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں۔ بابل کی سرزمین سے جو اسطوانے یا نکلے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے۔ اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا۔

ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے، اساطیر نام ہے کسی بات کی خیالی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو۔

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار قبل مردے زندہ ہو گئے تھے وہ غالباً کہے گا ہاں ہوئے ہوں گے۔ اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے، تو وہ کہے گا دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ کیا تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردے کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمہیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا۔

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودی کے لئے جتنے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرنا بھی معجزہ کے ذریعہ ہوا، جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لئے ہوتا تھا، دریا نیل ان کے لئے مسخر کیا گیا، من و سلویٰ ان کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا، لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پروا نہیں کی اور جب تک بچھڑا بنا کر پوج نہیں لیا گیا انہیں چین نہ آیا۔

اسی طرح مسیح نے بھی بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ وہی مردے جن کو انہوں نے زندہ کیا وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑی جنہیں اچھا کیا ان پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا؟ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے، بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔

پانی کو شراب بنا دینا، سینکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، طوفان کو خاموش کر دینا، پانی پر چلنا یہ سب باتیں ہیں جنہیں انسان سوچتا تھا جن کے پورا ہو

نے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انہی کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت اور تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل اور خوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش کرنے کے لئے مندر بنائے قربان گاہیں تیار کیں۔ ان کے سامنے ناک رگڑیں قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خوش ہو سکتے تھے۔ لیکن ان آسمانی قوتوں نے ایک نہ سنی، ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہنچا، طوفان بھی آئے کھیتیاں بھی برباد ہوئیں وبائیں بھی پھیلیں جن کو برے حال جینا تھا وہ برے حال ہی جئے اور جنہیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے۔

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لئے ہے، اسی کی ضرورت پورا کرنے کے لئے کائنات وجود میں آئی۔ چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع اور غروب ہوتا یہی بہار و خزاں ہوتی گلاب اسی طرح کھلتا، انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں۔ وہی سمندر کا مدوجزر رہتا اور وہی رات دن وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد و برق۔

جب ایک زمانہ ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے بصری کی حالت میں گزر گیا، تو کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انہوں نے ان معجزات اور روایات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انہوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے؟ اور آخر کار انہوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولاد آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے۔

گلیلو، کوپرنیکس اور کپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیت کو درہم برہم کر دیا زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول اور ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہوگئی، آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلاء محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا۔

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ تاریکی جو زمانہ معلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی۔ آخر کار جہل نے علم کے خلاف ایک

بقیہ صفحہ نمبر 43 پر

شیخ راشد احمد

مکافات عمل کیا ہے؟

شاید آپ نے "مکافات عمل کرم" کا نام ہزار بار سنا ہوگا۔لیکن کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ آپ کی زندگی جیسی آج ہے، چاہے اچھی ہو یا بری، اس کی کہانی آپ نے خود لکھی ہے؟ ہاں، اپنی قسمت کے مصنف تم خود ہو۔ ہر رشتہ جو بنایا ٹوٹا، ہر موقع جو آیا یا ہاتھ سے نکل گیا، ہر جدوجہد جس نے آپ کو رُلایا اور ہر کامیابی جس نے آپ کو خوش کیا۔۔سب کچھ آپ ہی عمال / کرموں کا نتیجہ ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم مکافات عمل / کرم کو صرف سزا اور انعام کا نظام سمجھ بیٹھے ہیں۔ جیسے اچھا کیا تو اللہ تعالیٰ انعام دیں گے، برا کیا تو سزا دیں گے۔ اور اسی وجہ سے لوگ مکافات عمل / کرم کو صرف ایک مذہبی خیال سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔مگر سچ یہ ہے کہ مکافات عمل / کرم کوئی وہم یا تصور نہیں بلکہ ایک زندہ سائنس ہے۔ جیسے کششِ ثقل ہر شے کو نیچے کھینچتی ہے، ویسے ہی مکافات عمل / کرم ہر عمل کا پھل آپ کی زندگی میں واپس لوٹا دیتا ہے۔سوچو ذرا! اگر آپ اپنے اعمالوں / کرموں کو سمجھ لو، تو کیا آپ اپنی زندگی کے مالک نہیں بن جاؤ گے؟

ربّانی کتب کہتی ہیں کہ عمل / کرم تین طرح کے ہوتے ہیں:

عمل / کرم : وہ کام جو دیانتداری، ایمانداری، اُصولوں اور قانون کے ساتھ کیا جائے، جیسے سچ بولنا، فرض ادا کرنا، کسی کی مدد کرنا۔

عمل / کرم : وہ غلط کام جو ہمیں نہیں کرنے چاہئیں، لیکن ہم کر بیٹھتے ہیں، جیسے جھوٹ بولنا، چوری کرنا، کسی کو تکلیف دینا۔

عمل / کرم : وہ کام جو ہم بے غرض ہو کر صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتے ہیں، بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی نتیجے کی توقع کے۔ ایسے اعمال ہمیں اندر سے آزاد کر دیتے ہیں۔

آپ سمجھ رہے ہیں؟ صرف آپ کا عمل ہی کام / کرم نہیں ہے بلکہ آپ کا ارادہ بھی عمل / کرم ہے۔ اگر آپ نے کسی کی مدد دکھاوے کے لئے کی، تو وہ بھی کرم ہے۔تم خاموش رہے اور اس خاموشی نے کسی کو اذیت دی یا سکون دیا، یہ بھی کرم ہے۔تمہارا ہر خیال، ہر عمل ایک بیج ہے جو ایک دن پھل بن کر ضرور لوٹے گا۔

اب آتے ہیں اعمال / کرم کی اقسام پر:

ا] آپ زندگی کے وہ اعمال / کرم جن کے نتائج اور اثرات ابھی آپ کی زندگی نہیں آئے، یعنی ابھی آنا باقی ہیں۔

۲] وہ اعمال / کرم جن کا پھل اسی زندگی میں بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ جیسے کوئی پیدائشی دولت مند ہو یا کوئی پیدائش سے ہی مشکلات جھیل رہا ہو۔

۳] وہ اعمال جو آپ اس وقت کر رہے ہو اور یہی تمہارا مستقبل [مقدر] لکھ رہے ہیں۔ انسان کا عمل / کردار ہی اس کا مقدر ہے۔

اب سوال یہ ہے: کیا ہم اپنے آج کے اچھے کاموں / کرموں سے پچھلے برے کاموں / کرموں کو مٹا سکتے ہیں؟ جواب ہے — نہیں۔ انہیں مٹایا نہیں جا سکتا۔لیکن ان کے اثرات کو ضرور کم کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر پچھلے برے کاموں / کرموں کی وجہ سے تمہیں کوئی بڑا دکھ ملنے والا تھا تو موجودہ اچھے کام / کرم اس دکھ کو چھوٹی سی پریشانی میں بدل سکتے ہیں۔ یہی ہے مکافات عمل کی اصل خوبصورتی — عدل وانصاف، جو غیر جانبدار اور ربّانی ہے۔

اب میں آپ سے ایک سادہ سا سوال کرتا ہوں: کیا آپ اپنی موجودہ زندگی کو بیداری / ہوشمندی کے ساتھ جی رہے ہیں یا پھر آپ صرف ماضی کی غلطیاں دہرا رہے ہیں؟ یاد رکھو! آپ کا ہر کرم، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، آپ کی زندگی کا کل [مستقبل] لکھ رہا ہے۔ اگر آپ بار بار غلطیاں دہراتے رہیں گے، تو برے اعمال / کاموں / کرموں کا بوجھ بڑھتا جائے گا۔

لیکن اگر آپ سمجھداری کے ساتھ ایمانداری اور بے غرضی سے زندگی گزارنا شروع کر دیں، تو وہیں سے کرم کے بندھن ٹوٹنے لگتے ہیں اور وہیں سے آنے والے برے دنوں سے آزادی کی راہ شروع ہوتی ہے۔ نہ کسی شارٹ کٹ سے، نہ کسی سودے بازی سے، بلکہ ایک سادہ

سے اصول سے — ہر عمل / کام / کرم کو ذرا زیادہ ایمانداری، دیانتداری اور سچائی سے کرو، ذرا زیادہ ہمدردی کے ساتھ کرو، بغیر تکبر اور بغیر لالچ کے کرو۔ اور جب آپ ایسا کرنے لگتے ہیں، تو آپ برے اعمالوں / کرم کے بندھن میں نہیں بلکہ انسان نیک نیتی کے ساتھ بے غرض ہو کر اپنا فرض ادا کرے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے کے اُصول کے راستے پر چل کر اعمال کرے، تو ایسے انسان حقیقی زندگی جینے لگتے ہو۔

میں یہاں چھوٹی سی مثالیں دے کر بات واضح کر دوں مثلاً فرض کریں ایک استاد بچوں کو پڑھاتا ہے، اگر وہ وہ یہ سوچ کر پڑھاتا ہے کہ صرف زیادہ تنخواہ یا شہرت ملے تو یہ عام عمل ہے، لیکن اگر وہ نیک نیتی سے بغیر ذاتی فائدے کی فکر کے، صرف یہ سوچ کر پڑھاتا کہ بچے علم سیکھیں اور ان کا مستقبل بہتر ہو۔ تو یہ بے غرض عمل ہے،،، اسی طرح کسان کھیت میں بیج ڈالتا ہے، مگر بارش یا فصل کی پیداوار اُس کے ہاتھ میں نہیں، اُس کا فرض ہے محنت کرنا، باقی نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا، یہ بے غرض عمل ہے۔ یعنی عمل کرو، مگر نتیجے کی فکر میں نہ پڑو۔۔۔ یعنی یہ دُعا کہ .. اے رب مجھے وہ ہمت دے کہ میں خلوص سے عمل کروں، نتائج تیری رضا پر چھوڑ دوں تاکہ میرا ہر فرض عبادت بن جائے۔

یہ اس سوچ کو کہتے ہیں کہ انسان اپنے روز مرہ کے کام، اپنی ذمہ داریاں اور فرائض دل سے، ایمان داری سے اور بغیر لالچ و مفاد کے بھرپور طریقے سے کرے،، نتیجہ اللہ / رب پر چھوڑ دے،، سادہ الفاظ میں ۔۔ نیک نیتی کے ساتھ بے غرض عمل کرنا۔

تو قارئین کرام! یاد رکھیں مکافات عمل کوئی سزا نہیں ہے بلکہ ایک آئینہ ہے جو ماضی میں آپ کے اعمال اور آپ کی نیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور آپ کے پاس آج بھی یہ اختیار ہے کہ اپنے موجودہ اعمال کو ایسا بناؤ کہ آپ کا کل [مستقبل] روشن ہو۔

اُمید ہے قارئین کرام مکافات عمل کو سمجھ گئے ہوں گے؟ تو آج ہی یہ عہد کر لیں کہ اپنے اعمالوں / کرموں کو ایمانداری، دیانتداری، بیداری اور سمجھداری کے ساتھ کرنا شروع کر دیں، کیونکہ آپ کی زندگی کا کل [مستقبل / مقدر] آپ آج لکھ رہے ہو۔

==============================

جب قرآن مکمل ضابطہ حیات ہوا کرتا تھا، تب مسلم حاکم تھے اور جب قرآن کو صرف ثواب کمانے کا ذریعہ بنایا تو مسلمان محکوم ہو گئے۔